ڈاکٹر سید ظفر محمود کے شائع شدہ اردو مضامین

Published Urdu Articles of Dr Syed Zafar Mahmood

2017

Published in 05 Jan-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

جزیرۃ العرب ساتویں صدی عیسوی میں باہمی تصادم میں ملوث دو طاقتور شہنشاہی سلطنتوں، رومی بازنطینی و ایرانی ساسانی(Roman-Byzantine and Persian-Sassanian)کے درمیان تکلیف دہ انداز میں شکنجہ آلود تھا اور اندرونی تفرقہ آمیز قبیلوں کا مرہون منت تھا۔ لیکن اس کے سو برس کے اندر ہی دونوں متصل شہنشاہی سلطنتیں عرب کی نوخیز روحانیت ،حکمت عملی ولشکر کشی (Strategy) کے زیر نگیں ہو گئیں کیونکہ اسلام کی چھتری کے نیچے جزیرۃ العرب اندرونی طور پر متحد(Galvanise & unite) ہو چکا تھا۔ دین اسلام فرد کا خدا کے ساتھ رشتہ بھی بناتا ہے اور سماجی وسیاسی قطار بندی کے متعلق رہنمائی بھی کرتا ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے وقت آن پڑا ہے کہ ہم بھی پھر سبق پڑھیں صداقت کا، شجاعت کا اور عدالت کا، کیونکہ ہم سے دنیا میں معماری کا م لیا جانا ہے جس کے لیے ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہے، اس کی تیاری کے لیے ہمیں اپنے وجود کو مستحکم کرنا پڑے گا۔ اس مہم میں سبھی کلمہ گو خواتین وحضرات کو ساتھ آنا ہوگا۔ کوئی یہ نہ سوچے کہ ہم تو محفوظ ہیں ہمیں کیا ضرورت ہے، کیوں ہم صرف اپنے طبقہ کی بات کریں۔ صرف اتنا ہی سوچ لینا کافی ہے کہ کیا ہم اپنے آپ کو سابق ممبر پارلیمنٹ احسان جعفری کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ محسوس کرتے ہیں۔

خدا کے قریب ترین پہنچ کر کے بھی پیغمبرؐ ایک نئی تخلیقانہ صلاحیت سے مصلح ہو کر انسانوں کے پاس واپس لوٹتے ہیں تا کہ تجدید شدہ فرمان الٰہی کی روشنی میں دنیا کی تخلیق نو کر سکیں۔ اس طرح وہ اپنے کو وقت کی وسیع خم دار گردش میں پیوست کر دیتے ہیں تا کہ وہ تاریخ کی طاقت پر قابو پا کر اس کی دھارا بدل دیں اور نئے معیاروں والی نئی دنیا کی تعمیر کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور سینا پر اپنے کو شعلوں میں ضم نہیں کر دیا بلکہ وہاں حکم ربانی سے سبق سیکھ کر واپس آئے اور اپنی امت کو نئے افق پر لے گئے۔ اسی پیمبرانہ سنت کی اطاعت کو آج ہم سب کو اپنا لائحہ عمل بنانا ہے خاص کر الیکشن 2017 کے ضمن میں 'ہمیں حکمت عملی سے کام لینا ہے۔ ہر خود غرضی اور مطلب پرستی کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خود مختاری، خود احترامی، خود وثوقی کے ساتھ فرض شناسی پر قائم رہنا ہے۔ یقین مانئے کہ ہمارے ضمیر کی چمکدار روشنی ہمارے ذہنی انتشار کو یکجا کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ ہم میں ایک خاموش قوت ہے جو عملی جامہ میں آنے کے لیے بیتاب ہے۔ ہم اپنی عقل کے ساتھ عشق حقیقی کو جوڑ کے رکھیں تو بہترین نتائج مل سکتے ہیں۔ متحرک لوگوں کے لیے امکان قوت اس سے طے ہوتا ہے کہ ان میں چیلنج کا سامنا کرنے کا کتنا حوصلہ ہے۔

میڈیا والے ٹی وی کے پردہ پر دکھتے ہیں ہم سے جاننے کے لیے کہ کس طرف سیاسی ہوا بہہ رہی ہے، لیکن ملت تعریف کے لائق ہے کہ کچھ بتا کے نہیں دیتی ہے 'بہت خوب' آفریں، آفریں۔ اپنے اپنے انتخابی حلقہ میں خود آپس میں مل کے طے کیجیے کہ ہمارے مفاد میں کس امیدوار کو نہیں جیتنا چاہیے اور کس امیدوار کو جیتنا چاہیے اور سب مل کے اسی کے حق میں اپنا ووٹ ڈالیں۔ کچھ انتخابی حلقے تو بہت ہی خاص ہیں، جہاں ہمارے کندھے پر پوری ملت کی ذمہ داری ہے، پورے ملک کے لوگ وہاں کے ووٹروں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں، انھیں یقین محکم ہے کہ وہاں کے ووٹر انھیں مایوس نہیں کریں گے بلکہ ملت کی قومی اور سرفرازی کی وجہ بنیں گے۔ وہاں جدید، نادر اور انوکھے طریقے نکالے جانے چاہئیں ووٹروں تک اپنی بات پہنچانے کے۔ ہمیں دوڑ بھاگ کر کے، زیادہ متحرک ہو کے وقت سے زبانی طور پر صحیح پیغام ہر طرف عام کر دینا چاہیے یہ سوچ کے کہ اگر ہم آج ہی دنیا سے چلے جائیں تو بھی صحیح پیغام صحیح جگہ وقت سے پہنچا جائیں تا کہ ہماری نسلیں مضبوط رہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ ووٹوں کی سیاسی قطب سازی کے لیے دنگا پالیسی کا کس طرح ملک شکار رہا ہے۔ فیض احمد فیض کی زبانی یہ کہنے کا دل چاہتا ہے:

تو دشنۂ نفرت کو ہی لہراتا رہا ہے
تو نے کبھی دشمن سے لپٹ کر نہیں دیکھا
میری طرح تو نے شب ہجراں نہیں کاٹی
میری طرح اس تیغ پہ کٹ کر نہیں دیکھا

لہٰذا قرآن کریم کی سورہ القلم کی آیت 16 پڑھنا اور سمجھنا اور اس کا ورد کرنا ضروری ہے۔ تفسیر ابن کثیر کے مطابق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ ناپسندیدہ شخص جو دنیا میں فسادی کارروائی کرتا پھرتا ہے اور جو برائی کے لیے مشہور ہو ایسے شخص پر شیطان کا غلبہ بہت زیادہ رہا کرتا ہے، وہ دین کی توہین کرتا ہے، وہ ترش رو ہو کر منھ بنا لیتا ہے، ہم نے اسے بہت سا مال اور کشائش دے رکھی ہے پھر بھی اس کی طمع ہے کہ ہم اسے اور دیں، ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم اسے عنقریب بدترین مصیبت میں ڈالیں گے۔ اس قدر رسوا کریں گے کہ اس کی برائی کسی پر پوشیدہ نہ رہے گی۔

"اپنے ہندوستانی ہونے پر ہمیں فخر ہے۔ ہم اب سیاسی فٹ بال بننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور جس نے اس کی کوشش کی اس کو ہم اپنے ووٹ کے ذریعہ سبق سکھا دیتے ہیں۔ تو جب ہمارا اللہ، ہمارا دین، ہمارے رسولؐ، ہماری تاریخ، ہماری میراث، ہمارے بہی خواہوں کا ضمیر سب ہمارے حق میں ہیں تو پھر ہم اپنا قومی فریضہ نبھانے میں کیوں پیچھے رہیں؟"

اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ کی اس حکایت پر بھی عمل کریں کہ لَا تَفَرَّقُوا (3.103) یعنی آپس میں ہم تفرقہ نہ کریں بلکہ اجتماعی فلاح و بہبود کی خاطر بے غرضی سے متحد ہو جائیں اور اپنے ووٹ کو بٹنے نہ دیں۔ ہر انتخابی حلقہ میں ہمارے گروپ بن جائیں اور یہ غور کریں کہ فرقہ پرست طاقتوں کو روکنے کے لیے ہمارا کون پسندیدہ امیدوار ایسا ہے کہ اس کے جیتنے کی امید ہے۔ بس اتفاق رائے سے سب مل کر اسی امیدوار کو اپنا ووٹ دے دیں۔ یہ ضروری نہیں کہ پورے ملک میں کسی ایک چنندہ پارٹی کو ووٹ دیا جائے۔ اس الیکشن میں کسی بھی پارٹی کو ہمہ گیر فوقیت دینے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہر انتخابی حلقہ میں ملت کے حق والے امیدواروں میں سے انتخاب کرنا ہے کہ کس کو ہم مل کے ووٹ دے دیں تو ہمارے ووٹ اس کو جتا دیں گے۔ اس الیکشن کے ذریعہ پورے ملک کے سیاسی تانے بانے کی کئی پشتوں کو صاف پیغام جانا چاہیے کہ ہم اب کوئی واہیات یا لغویات برداشت نہیں کریں گے، ہم برابر کے شہری ہیں اور اپنے آئینی حقوق کے متعلق خوب آگاہ ہیں، اپنے ہندوستانی ہونے پر ہمیں فخر ہے۔ ہم اب سیاسی فٹ بال بننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور جس نے اس کی کوشش کی اس کو ہم اپنے ووٹ کے ذریعہ سبق سکھا دیتے ہیں۔ تو جب ہمارا اللہ، ہمارا دین، ہمارے رسولؐ، ہماری تاریخ، ہماری میراث، ہمارے بہی خواہوں کا ضمیر سب ہمارے حق میں ہیں تو پھر ہم اپنا قومی فریضہ نبھانے میں کیوں پیچھے رہیں؟ بس ہمیں اپنے دل اور دماغ دونوں میں یکسوئی لے آنی ہے اور اپنے اپنے انتخابی حلقہ میں حکمت عملی کا استعمال کرنا ہے، بقول اقبال:

کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینہ میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آراان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 19 Jan-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

مستقبل کے لئے ہمارا روڈ میپ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

ملک کے بدلے ہوئے حالات کے مد نظر میں نے اپنے حالیہ مضامین میں قارئین کی توجہ دلائی تھی کہ اگلے صوبائی انتخابات میں ہمارا ووٹ نہ بٹے اس کے لئے طویل مدتی پلان فوراً شروع کر دینا ہو گا، ہمیں اپنے سماج کو منظم کرنا ہو گا۔ ہر انتخابی حلقہ میں ملت کے چند کیمیا گروں (علامہ اقبال کی اصطلاح میں کچے تانبے کو سونے میں تبدیل کرنے والے لوگ) کو ملت کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھ میں لینی ہو گی، انھیں مستقل ملت کی فلاح کے کام کر کے اپنے انتخابی حلقہ میں مسلمانوں کا بھروسہ جیتنا ہو گا تا کہ الیکشن کے وقت عوام ان کی رائے پر جذبہ شوق سے توجہ دیں۔ اس کے بعد کئی اہل خیر نے مجھے لکھا کہ میں اس مقصد کے حصول کے لئے ایک نقشہ راہ یا روڈ میپ (Roadmap) بھی تجویز کر دوں، جن خواتین و حضرات نے میرے حالیہ مضامین پڑھ رکھے ہیں ان سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنے انتخابی حلقہ پر توجہ مرکوز کریں اور اپنی طرح کے 10-8 دیگر بے لوث لوگوں کی شناخت کر کے انھیں اپنے ساتھ شامل کر لیں، اپنے گھروں میں سے ایک باہری کمرہ کو دفتر بنا لیں، ایک میز کرسی، کمپیوٹر، انٹرنٹ کا انتظام کر کے مردم شماری کے رجسٹرار جنرل (Registrar General of Census Operations) کی ویب سائٹ censusofindia.gov.in پر جا کر اپنے انتخابی حلقہ میں کل آبادی، مسلم آبادی اور اس کا تناسب اور ہر گاؤں اور محلّہ کے اعداد و شمار معلوم کر لیں اس کا پرنٹ آؤٹ دیوار پر لگائیں اور ایک نقل فائل میں رکھیں۔

مرکزی وزارت برائے اقلیتی امور کی ویب سائٹ minorityaffairs.gov.in پر اقلیتوں کے لئے متعدد اسکیموں کا تفصیلی ذکر ہے: کوچنگ پروگرام، ملٹی سیکٹورل ڈیولپمنٹ پلان (MSDP)، اسکالرشپ اسکیم، فری کوچنگ اینڈ الائڈ اسکیم، گرانٹ اِن ایڈ اسکیم، ڈیولپمنٹ اینڈ فائنانس کارپوریشن، نئی روشنی برائے خواتین، ہنرمندی کے فروغ کے لئے 'سیکھو اور کماؤ' اسکیم، یو پی ایس سی اور صوبائی پبلک سروس کمیشن اور اسٹاف سلیکشن کمیشن کے ذریعہ منعقد پری لیمنری امتحانوں میں کامیاب امیدواروں کے لئے امدادی اسکیم، ہائر تعلیمی اداروں کے اساتذہ کی مزید ٹریننگ کے لئے نالندہ اسکیم اور مائنارٹی سائبر گرام۔

دوم، مرکزی ایچ آر ڈی منسٹری کی ویب سائٹ mhrd.gov.in/schemes_home پر ان اسکیموں کو بغور پڑھیں: سروشکشا ابھیان، مدارس میں کمپیوٹر و سائنس وغیرہ پڑھانے کی معقول امدادی اسکیم SPQEM، راشٹریہ مادھیہ مک شکشا ابھیان، لڑکیوں کے لئے سیکنڈری تعلیمی اسکیم، قومی اسکالرشپ اسکیم، علاقائی زبانوں کی پڑھائی کے لئے ٹیچرس اسکیم، تعلیم بالغان اسکیم، لڑکیوں کے لئے ہاسٹل اسکیم، ماڈل اسکول اسکیم، سکنڈری تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے کی اسکیم، ساکشر بھارت اسکیم، صوبائی ریسورس مرکز، جن شکشن سنستھان، رضا کارانہ تنظیموں کے لئے امدادی اسکیم اور اساتذہ کی ٹریننگ کے لئے مرکزی اسکیم۔

حق اطلاعات قانون کے تحت معلومات کی جائے اور پھر افسران سے گفت و شنید کی جائے۔قومی سطح کے دیگر اہم مسلم مسائل کے متعلق تفصیلی معلومات نیٹ پر موجود ہے۔خاص طور پر اگر آپ کا انتخابی حلقہ شیڈولڈ کاسٹ کے لئے ریزرو ہے جبکہ وہاں مسلمانوں کی تصدیق شدہ فیصد شیڈولڈ کاسٹ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے تو پورا کیس تیار کرنا ہو گا اور مہم چلانی ہو گی کہ آپ کے انتخابی حلقہ کو ریزرویشن سے آزاد کیا جائے۔

سوم، مرکزی ہوم منسٹری کی ویب سائٹ mha.nic.in/scheme پر تین اسکیموں کا مطالعہ کریں: دہشت گردی اور فرقہ وارانہ تشدد کے متاثرین کے لئے امدادی اسکیم، کبیر پُرسکار اور قومی یکجہتی کے لئے رضا کارنہ تنظیموں کی امدادی اسکیم۔ مرکزی وقف کونسل کی ویب سائٹ centralwakfcouncil.org پر تین اسکیمیں دی ہوئی ہیں: آئی ٹی آئی، پیشہ ورانہ تعلیمی مرکز یا ووکیشنل ایجوکیشن سینٹر اور کتابوں کی فراہمی یا بک بینک و لائبریری۔ مرکزی وقف کونسل کی دیگر ویب سائٹ wamsi.nic.in پر جا کر اپنے حلقہ کی تمام وقف املاک کی مکمل معلومات حاصل کر لیں، اس کے بھی پرنٹ آؤٹ لے کر دیوار و فائل میں لگائیں۔ ہر وقف جائداد میں خود جائیں، معلوم کریں متولی کون ہیں، ان سے معلومات حاصل کریں، جائداد کی تصاویر اتاریں، وقف بینامہ کی نقل حاصل کریں اور اپنی ایک الگ فائل کھول کر اس میں لگائیں۔ اندازہ لگائیں کہ بینامہ کے اغراض و مقاصد کے مطابق وقف جائداد کا مکمل استعمال ہو رہا ہے کہ نہیں اور جتنی آمدنی ہونی چاہئے اتنی ہو رہی ہے کہ نہیں۔ کیا جائداد پر کوئی ناجائز قبضہ ہے، کیا مناسب حساب کتاب رکھا جا رہا ہے، کیا عدالت میں کوئی مقدمہ چل رہا ہے، اس کی پیروی صحیح طور پر ہو رہی ہے کہ نہیں، جائداد کا کرایہ موجودہ بازاری ریٹ پر آرہا ہے کہ نہیں۔ اقلیتوں کے لئے وزیر اعظم کے 15 نکاتی پروگرام minorityaffairs.gov.in/pm15point کے ہر نکتہ کو بغور پڑھیں اور جائزہ لیں کہ آپ کے انتخابی حلقہ میں ان میں سے ہر نکتہ کا کتنا نفاذ ہوا، جن ایشوز پر نفاذ میں کمی رہی ہے، ان کے متعلق حق اطلاعات قانون کے تحت معلومات کی جائے اور پھر افسران سے گفت وشنید کی جائے۔ قومی سطح کے دیگر اہم مسلم مسائل کے متعلق تفصیلی معلومات نیٹ پر موجود ہے۔ خاص طور پر اگر آپ کا انتخابی حلقہ شیڈولڈ کاسٹ کے لئے ریزرو ہے جبکہ وہاں مسلمانوں کی تصدیق شدہ فیصد شیڈولڈ کاسٹ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے تو پورا کیس تیار کرنا ہو گا اور مہم چلانی ہو گی کہ آپ کے انتخابی حلقہ کو ریزرویشن سے آزاد کیا جائے۔

ان سب اسکیموں کا گہرا مطالعہ کیا جائے، ان کے پرنٹ آؤٹ لئے جائیں، انھیں الگ الگ فائلوں میں رکھا جائے، ان کی نقلیں اپنے دفتر میں دیوار پر چسپاں کی جائیں؛ مختلف گاؤں اور محلوں میں ان لوگوں کی شناخت کی جائے جنھیں ان اسکیموں سے فائدہ پہنچنا چاہئے، درخواست کے فارم ڈاؤن لوڈ کر کے انھیں بھرنے میں ان کی مدد کی جائے اور ضروری دستاویز منسلک کرنے میں بھی ان کی مدد کی جائے، ان مکمل فارموں کی نقل دفتر کی فائل میں رکھی جائے پھر انھیں اسپیڈ پوسٹ یا رجسٹرڈ پوسٹ سے متعلقہ افسر کو بھیجا جائے اور وہاں اس درخواست پر کیا کارروائی ہو رہی ہے اس پر نظر رکھی جائے۔ اسی طرح کی فلاحی اسکیموں کو صوبائی ویب سائٹوں سے بھی ڈاؤن لوڈ کیا جائے اور ان پر بھی یہی سب کارروائی کی جائے۔ اگر صوبائی سطح کے کوئی خاص مسائل ہوں تو ان کی مکمل تحقیق کی جائے۔ ان سے متعلق تصدیق شدہ اعداد و شمار حاصل کئے جائیں، آپ کے حلقہ میں قبرستانوں کی کیا حالت ہے؟ اگر ان کے گرد چہاردیواری نہیں ہے تو اس کے لئے ایوان حکومت میں تگ و دو کی جائے۔ یو پی اور بہار میں تو حکومت نے یہ کام کرنے کا اعلان کر رکھا ہے، ضلعوں کی سرکاری ویب سائٹ پر بھی ذکر ہے۔ وہاں تو ذرا سی توجہ کرنے سے یہ کام غالباً بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ آپ اپنے ذریعہ کی گئی تمام کارروائی کی اطلاع وقتاً فوقتاً میڈیا کو دیتے رہیں اور یقینی بنائیں کہ اس طرح اور دیگر ذرائع سے ساری معلومات آپ کے انتخابی حلقہ میں ملت کے افراد تک پہنچتی رہے۔

جمعہ کے ائمہ و خطیب صاحبان سے درخواست کی جائے کہ مقتدی صاحبان کو عربی خطبہ کے معنی اور مفہوم بھی سمجھائے جائیں۔ ایسا کرنے میں ان کی مدد کی جائے، ان سے جمعہ کے معیاری عربی خطبہ کی نقل لے کر ماہرین کے ذریعہ اس کا مقامی زبان میں تصدیق شدہ ترجمہ کروا یا جائے اور ائمہ و خطیب صاحبان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ان سے یہ بھی درخواست کی جائے کہ جمعہ کے دن کی جانے والی مقامی زبان میں تقریر کے عنوان بھی پہلے سے پلان کر لئے جائیں اور تقریر کا مواد تحقیق کر کے تیار کر لیا جائے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Rashtriya Sahara 01 Feb 2017

آیئے ٹرمپ کی کوتاہ بینی سے سبق لیں

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

ڈونالڈ ٹرمپ نے مسلم اکثریت والے سات ممالک کے باشندوں کے امریکہ میں داخلہ پر تین ماہ کے لیے پابندیاں لگا دی ہیں، متعدد عدالتوں نے ٹرمپ کے اس حکم نامہ کے مختلف حصوں کے نفاذ پر روک لگائی ہے، امریکہ کے ہوائی اڈوں پر بڑی تعداد میں احتجاج ہو رہے ہیں، اس احتجاج کو مائیکروسافٹ، گوگل، ایمیزون، گولڈ مین سیکس اور فورڈ موٹرس کی پشت پناہی حاصل ہے اور براک اوباما کے ترجمان نے کہا ہے کہ سابق صدر کو ان احتجاجوں پر اطمینان ہو رہا ہے۔ ’ایکٹنگ اٹارنی جنرل سیلی ییٹس نے ٹرمپ کے حکم کا عدالت میں دفاع کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے انھیں اس عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے۔ امریکی وزارت خارجہ کے 100 سے زائد سفارتکاروں نے ٹرمپ کے حکم کے خلاف میمو میں لکھا ہے کہ اس سے امریکہ میں حملہ کے امکانات کم تو ہوں گے نہیں لیکن امریکیوں کے خلاف دنیا میں نفرت میں اضافہ ضرور ہو جائے گا‘۔ 16 صوبوں کے اٹارنی جنرلوں نے تحریری بیان میں اس حکم کی مذمت کی ہے، واشنگٹن کے اٹارنی جنرل اس حکم کے خلاف مقدمہ تیار کر رہے ہیں، لیکن ٹرمپ ابھی تک اپنے فیصلے پر قائم ہیں۔ یہ صرف ایک ملک کے صدر کے ذریعہ ایک حکم نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف صریح تعصب کرنے کے لیے ممالک اور افراد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جس کے خلاف دنیا بھر میں مظاہرے ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ لندن کے اخبار ’دی میل‘ میں شائع شدہ مشہور جرنلسٹ کم سین گپتا کے 26 جنوری 2017 کے مضمون کے مطابق ڈاکٹر موشے کنتور نے بھی پوپ فرینسس کو اس خطرناک سیاسی انتہاپسندی کے خلاف آگاہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ امریکہ میں ٹرمپ کی جیت اور اس کے بعد ان کے ذریعہ جاری کیے جانے والے احکامات سے یوروپی ممالک میں بھی انتہاپسند سیاسی جماعتوں کو فروغ ملے گا۔ فرانس، جرمنی اور نیدر لینڈ میں انتخابات ہونے والے ہیں، جہاں پوپ کے ذریعہ سمجھ بوجھ کا پیغام دیے جانے کے لیے وہ کوشاں ہیں۔ وہ یوروپ کے تمام ممالک اور ووٹروں سے اپیل کر رہے ہیں کہ دائیں بازو والی جماعتوں کا مقابلہ کریں اور انتہاپسندی کے شر سے دنیا کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ ادھر پوپ فرینسس پہلے ہی الیکشن جیتنے کے لیے عوامیت پسندی (Populism) کے خلاف بیان دے چکے ہیں، انھوں نے کہا کہ اس کے ذریعہ عدم استحکام (Instability) کو بڑھاوا ملتا ہے۔

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا لاس اینجلس کے پروفیسر خالد ابوالفضل نے اے بی سی ریلیجن اینڈ اِتھکس کے 19 جنوری 2017 کے شمارہ میں لکھا ہے کہ اخوان المسلمون (Muslim Brotherhood) کو غیر ملکی دہشت پسند تنظیم قرار دینے کے لیے غالبًا بل پیش ہونے والا ہے۔ اس بل کے روح رواں سینٹر ٹیڈ کروز نے بیان دیا ہے کہ اخوان شدید اسلامی تصور حیات کی تائید کرتا ہے اور اس کا مشن ہے مغرب کو تباہ کرنا۔ کروز نے ’سِولائزیشن جہاد‘ نامی دستاویز بھی تیار کر رکھا ہے جس میں اس نے CAIR, ISNA, NAIT وغیرہ نامور امریکی مسلم تنظیموں کو اخوان المسلمین سے الحاق کرنے کا مورد الزام قرار دیا ہے۔ کروز کے ساتھی فرینک گیفنی کو پہلے ہی چند امریکی صوبوں میں شریعت مخالف قوانین پاس کروانے کا شرف حاصل ہے، وہ اب ٹرمپ کا مشیر خاص ہے۔ پروفیسر خالد لکھتے ہیں کہ 1945 میں اقوام متحدہ کے قیام کے بعد سے اب تک کوئی ایسی منظّم منفی کوشش دنیا میں نہیں ہوئی ہے جیسی فی الوقت اسلام کے خلاف بداندیش اور زہریلی تاثیر والی یہ مہم چل رہی ہے۔ دراصل بقول خالد، کروز اور گیفنی کی طرح کے مغرب میں وہ لوگ ہیں جو اپنے سفید فام ہونے پر ناز کرتے ہیں۔ ان کا ساتھ وہ مسلم اور چند دیگر غیر فام افراد و ممالک دیتے ہیں، جن کی ذات کو ان کے اس منفی رویہ سے فرق نہیں پڑتا ہے اور وہ خودغرضی و چاپلوسی سے ان سفید فاموں کو چڑھا دیتے ہیں۔ اسی ماحول میں بیسویں صدی کی آخری دہائی میں سوویت یونین کا اختتام ہوا، جس کارروائی میں ان سفید فاموں کا ساتھ ان مسلم ممالک نے بھی دیا، لیکن اس کے بعد مال غنیمت میں ان مسلمانوں اور دیگر غیر سفید فاموں نے جب اپنا حصہ مانگا تو یہ سفید فام ناراض ہو کر کہنے لگے کہ یہ مسلم ممالک ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد وہ سفید فام لوگ مسلم ممالک سے واپس چلے جائیں گے۔ اس طرح اس کے بعد سے ان غصیلہ سفید فاموں نے اسلام کو اپنا تختہ مشق بنا رکھا ہے۔ اسی دوران 1993 کی سیموئیل ہنٹنگٹن کی کتاب ’تہذیبوں کا ٹکراؤ‘ (Clash of Civilzations) ان سفید فاموں کے لیے آسمانی تحفہ ثابت ہوئی، جس میں مغربی تہذیب کو دنیا میں برتری دی گئی ہے اور مغرب کو مخصوص اختیارات اور غیر معمولی رتبہ سے نوازا گیا ہے، ساتھ ہی یہ پیغام دیا گیا کہ باقی تمام تہذیبوں کو مغربی تہذیب کو اپنانا ہوگا، ورنہ صفحۂ ہستی سے مٹ جانا ہوگا۔

اس پس منظر میں آیئے جائزہ لیں نیویارک ٹائمز میں 13 نومبر 2016 کو شائع شدہ انعام یافتہ مشہور زمانہ مضمون نگار پنکج مشرا کی تخلیق کا بعنوان ’جمہوریت کی موجودہ حالت میں کہیں کچھ گلا سڑا تو ہے‘ (Something is rotten in the state of democracy)۔ انھوں نے بیسویں صدی کے فرانسیسی فلسفی جین پال سارترے کے حوالہ سے لکھا کہ اگر بڑی طاقت والے ملک میں صداقت کو قومیت کے لباس کے نیچے چھپا بھی دیا جائے تو بھی کالونیوں میں تو وہ صداقت صاف نظر آتی ہی ہے۔ پنکج کہتے ہیں کہ 2016 کے امریکی الیکشن میں جمہوریت کے فیل ہونے سے قبل اس کا یہی حال ہندوستان میں ہو چکا تھا۔ ان کے مطابق دونوں ملکوں میں مرکزی دھارا یا اتجاہ العام (Mainstream) کے افراد اور اداروں کی خود بینی، باطل پنداری، غیر دانشمندی اور ملی بھگت نے دائیں بازو کا ساتھ دیا۔ شرما جی کے مطابق اب ٹرمپ کو بلی پر چڑھانے کے ذمہ دار ہیں سماجی غیر مساوات کے رواج، سنگدل عالمگیر شخصیات، ضمیر فروش عوامی نمائندے، جوشیلے خیال پرست لوگ اور نیوز میڈیا جو یا تو زہر آلود ہے یا صاحب مروت۔ پنکج نے مزید لکھا کہ ایسی صورت حال میں ایک جذبات انگیز بازاری لیڈر جو سیاسی طاقت کی تڑک بھڑک، دولت اور شان سے مرعوب رہتا ہے وہ بہت سے دماغوں میں بستیاں قائم کر لیتا ہے۔ تب سماج کے کچھ طبقوں میں ذاتی دولت پیدا کرنے کی دوڑ شروع ہوتی ہے جو مساوات انسانی اور عوامی فلاح و بہبود کے معیاروں کا مذاق اڑاتی ہے۔

پنکج شرما کا کہنا ہے کہ دراصل بنیادی آئینی اغراض و مقاصد کی اسی تردید و منسوخی کی تحقیق ہونی چاہیے، تاکہ پتہ تو چلے کہ ہمارے زمانہ میں بازاری لیڈرشپ کی آتش زن اپیل آخر ہے کیا۔ وہ آگے لکھتے ہیں کہ 1950 میں ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا کہ ہندوستانی مٹی پر جمہوریت صرف ایک اوپری سجاوٹ ہی ہے کیونکہ ہندوستان کا بیشتر سماج تو فطری طور پر غیر جمہوری ہی ہے۔ ایسے میں ٹرمپ جیسے لیڈر سماج کے اندر کی آپسی بدگمانیوں کی ساز باز اور جوڑ توڑ کر لیتے ہیں تاکہ وہ کسی بھی طرح جیت ضرور جائیں۔ لیکن ووٹروں کی ذمہ داری تو ختم نہیں ہوتی، بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔ انھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ سیاست ہمارا کام نہیں ہے اور ہم اگر ووٹ دے سکیں گے تو دیں گے، ورنہ کوئی بات نہیں۔ ایسی سوچ فرد اور سماج دونوں کے لیے مہلک ہے۔ اس کے بجائے ووٹروں کو ایسے حالات میں زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ خصوصی ہم مسلمانان عالم کو تو ملکی آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے غیر معمولی طور پر متحرک ہو کر اپنے ووٹ کے ذریعہ صورت حال بدلنی ہی ہوگی۔ یوپی و دیگر صوبوں میں آنے والے الیکشن میں ہر مرد و عورت کو ووٹ ضرور ضرور ڈالنا ہے اور ملت کو اپنے اجتماعی ووٹ کو ضائع نہیں ہونے دینا ہے۔ اس کام کے لیے ہر انتخابی حلقہ میں 12-10 بے لوث مرد و عورتیں یہ ذمہ داری سنبھال لیں اور ووٹروں کے درمیان گھوم گھوم کر خاموشی سے اپنے انتخابی حلقہ کے لیے ملت کے حق میں اتفاق رائے تیار کریں۔

❐❖❐

”ٹرمپ جیسے لیڈر سماج کے اندر کی آپسی بدگمانیوں کی سازباز اور جوڑ توڑ کرلیتے ہیں تاکہ وہ کسی بھی طرح جیت ضرور جائیں۔ لیکن ووٹروں کی ذمہ داری تو ختم نہیں ہوتی، بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ سیاست ہمارا کام نہیں ہے اورہم اگر ووٹ دے سکیں گے تو دیں گے، ورنہ کوئی بات نہیں۔ ایسی سوچ فرد اور سماج دونوں کے لیے مہلک ہے۔“

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 09 Feb-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

نشست وار حکمت عملی اور صد فیصد ووٹنگ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

یوپی اسمبلی میں انتخابات سر پر آگئے ہیں۔ ملت کو اپنی آئینی اور سماجی ذمہ داری اس بار ضرور ضرور پوری کرنی ہے۔ کیرانہ (شاملی) میں مردم شاری کے مطابق مسلم آبادی 63 فیصد ہے، پھر بھی 1957 سے اب تک منعقد 16 انتخابات میں سے صرف 5 میں ہی وہاں سے ملت اپنا نمائندہ اسمبلی میں بھیج سکی ہے۔ 2012 کے اسمبلی الیکشن میں بھی ملت وہاں سے اپنا نمائندہ نہیں چن سکی کیونکہ اس کے ووٹ صوبہ کی دو سیکولر پارٹیوں کے درمیان تقسیم ہوگئے۔ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ ملت کے مقامی سمجھدار لوگوں نے توجہ نہیں کی اور یکجہتی پیدا کرنے کے لیے اپنا وقت نہ لگا کے اپنے ووٹ کی اہمیت کو ضائع کردیا، بعد میں 2014 میں وہاں درمیانی مدت کا انتخاب ہوا، جس میں حالات بہتر ہو سکے۔ امید ہے کہ 2017 کے الیکشن میں ہم اپنا ملی و دستوری فریضہ پوری طرح نبھائیں گے۔ یہی حال مراد آباد کے ٹھاکردوارہ میں ہوا، جبکہ وہاں ملی آبادی 52 فیصد ہے۔ وہاں سے بھی پچھلے 17 انتخابات میں سے صرف 6 دفعہ ہی ملت اپنا نمائندہ ایوان میں بھیج سکی ہے۔ 2012 میں وہاں بھی ہم محو غفلت رہے اور پھر 2014 کے درمیانی مدت کے انتخاب میں ہی سدھار ہو سکا، اب تو ہمیں ہمیشہ کے لیے سبق لے ہی لینا چاہیے۔ ضلع غازی آباد کے صاحب آباد اسمبلی حلقہ میں بھی ہماری آبادی 50 فیصد ہے لیکن پھر بھی ہم اپنا دستوری حق نہیں جتا پاتے ہیں۔ خدارا اب تو جاگ جائیے اور سوچ سمجھ کے، آپسی گفت و شنید کے ذریعہ اتفاق رائے قائم کیجیے۔

بہرائچ کے قیصر گنج کی داستان بھی عجیب ہی ہے، وہاں بھی مسلم آبادی 45 فیصد ہے جس میں سے آدھے سے زیادہ لوگ 2012 کے الیکشن میں ووٹ دینے آئے ہی نہیں، عزیزو! کیوں اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔ اب کی بار 100 فیصد ووٹ پڑنا چاہیے اور پہلے سے ہی وہاں کے سمجھدار اور بے لوث ملی افراد غور و فکر کر کے اتحاد قائم کریں۔ یہی المیہ سہارنپور شہر کا بھی ہے، وہاں کی بھی ملی طاقت 45 فیصد ہے لیکن وہاں بھی غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ پورے صوبہ کے لوگوں کو جاگنا ہوگا اور چوکنا رہنا ہوگا، میرٹھ کے چار انتخابی حلقوں میرٹھ خاص، میرٹھ کینٹ، میرٹھ جنوبی اور سردھنہ میں سب جگہ افراد ملت اپنی اہمیت کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ ان سب انتخابی حلقوں میں ملی ووٹ ایک تہائی سے زیادہ ہے اگر اتحاد ہوجائے تو آپ کا ہی نمائندہ چاروں جگہوں سے منتخب ہوگا، متحرک ہو جایئے، اتفاق رائے قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو جایئے، نتیجہ ضرور اچھا ہی رہے گا۔ بجنور شہر، ضلع بجنور کا نورپور، بریلی شہر، بریلی کینٹ، بھوجی پورہ، آنولہ، شاہجہانپور اور فیروزآباد میں سے ہر انتخابی حلقہ میں مسلم آبادی ایک چوتھائی سے ایک تہائی کے درمیان ہے، یاد رکھئے:

جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اب ذرا دار السلطنت کی طرف رخ کرتے ہیں، لیجیے یہاں تو چراغ تلے اندھیرا ہے۔ پورے ضلع میں مسلم آبادی ایک چوتھائی سے زائد ہے، لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار اکا دکا ہی ملی نمائندہ نظر آتا ہے جبکہ یہاں کے ہر انتخابی حلقہ میں ہر چوتھا نمائندہ مسلمان ہونا چاہیے۔

فی الحال اپنا تجزیاتی سفر جاری رکھیں۔ صوبہ کے پورب میں گینساری اور اترولہ (دونوں ضلع بلرامپور میں ہیں) میں مسلم آبادی 45 فیصد ہے، وہاں بھی اپنا حق لینے اور برقرار رکھنے کے لیے ملت کے مقامی خواتین و حضرات کو تگ و دو کرنی چاہیے۔ قریب کے ضلع فیض آباد میں انتخابی حلقہ ردولی لگا ہوا ہے، وہاں بھی مسلم ووٹ ایک تہائی ہے لیکن نمائندگی ندارد، اہل ردولی کے لیے بھی جہان مکافات آن پڑا ہے۔ دوسری سمت میں بڑھتے ہیں تو ضلع کانپور کی گووند نگر اسمبلی نشست، ضلع کشی نگر کی فاضل نگر سیٹ، سدھارتھ نگر کی بنسی سیٹ، گونڈہ کی کٹرا بازار کے علاوہ بنارس شمالی، بنارس کینٹ اور بنارس جنوبی میں ملت کے افراد کو فوری طور پر متحرک ہوجانا ہے، تاکہ انھیں آنے والے الیکشن میں اپنا کھویا ہوا وقار واپس مل جائے۔ خوش آئند ہے کہ پچھلے اسمبلی الیکشن 2012 میں ضلع مظفر نگر کی بڈھانہ و میراں پور، ضلع بدایوں میں بلال، ضلع سدھارتھ نگر کے ڈومریا گنج اور ضلع بجنور کے چاندپور میں افراد ملت نے مثالی اتحاد دکھایا تھا، جس کے لیے وہ قابل تحسین ہیں۔ لیکن دوسری طرف میرٹھ کینٹ میں ایک تہائی سے زائد مسلم آبادی کے باوجود کبھی بھی وہاں کی نمائندگی مسلمانوں نے نہیں کی۔ ساتھ ہی بٹھاری چینپور (ضلع بریلی)، بلاسپور (ضلع رامپور)، دیوبند، بارکھیڑا (پیلی بھیت)، مہداول (سنت کبیر نگر)، بشوناتھ پور (پرتاپ گڑھ)، چھپرولی (گونڈہ)، شیخوپور (بدایوں)، لکھنؤ پورب اور مہاسی (بہرائچ) میں 2012 کے الیکشن میں ایک تہائی مسلم آبادی کے باوجود نہ جیتنے والا امیدوار مسلم تھا اور نہ نمبر دو والا۔ ردولی میں ایک تہائی مسلم آبادی کے باوجود مسلم امیدوار چند ووٹوں سے ہار گیا۔ لہٰذا مسلمانوں کو فوری طور پر اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے:

جنبش سے زندگی جہاں کی

ساتھ ہی ہمیں یاد رکھنا ہے کہ گزشتہ الیکشن میں جن انتخابی حلقوں میں ملت کے نمائندے جیت گئے تھے، انھیں بھی اس بار زیادہ مطمئن اور آسودہ خاطر نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اِن پانچ برسوں میں یوپی کے ووٹوں میں الٹ پھیر بھی خوب ہوا ہے، اس لیے اس بار بھی اپنی جیت کو برقرار رکھنے کے لیے اضافی محنت کرنی ہوگی۔

”ہندوستان کے لوگ اگر یوگا کے ذریعہ یکجا کیے جاسکتے ہیں تو نماز بھی انھیں جوڑ سکتی ہے۔ اگر کسی جمہوری ملک کی پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں ایک مذہب کے ماننے والے 70 سال تک اپنی نمائندگی کسی دوسرے مذہب کے لوگوں کے ذریعہ ہی کرواتے رہیں تو اس کو جمہوریت کی خستہ حالی سمجھا جانا چاہیے۔“

اس نہج پر چلنے سے خاموش طور پر ہم اپنے ملک کی سیاسی نکیل پکڑ کے اسے سیدھے راستے پر لے جاسکتے ہیں اور ہمیں بیجا شاطرانہ فضولیات میں الجھنے سے بچے رہنا ہے۔ مثلاً ایک چینل نے قصداً مسلمانوں کو ذہنی طور پر ستانے کے لیے ایک عجیب الخلقت انسان کو کناڈا سے امپورٹ کرکے ہم پر مسلط کردیا ہے۔ وہ شخص بے سر پیر کی باتیں کرتا رہتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اپنی نازیبا کلامی سے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرتا رہتا ہے۔ اس کی اور اس چینل کی یہ حرکت دستور ہند کی دفعہ 51A(e) کی صریح خلاف ورزی کی مرتکب ہیں اور ان دونوں کے خلاف قانونی کارروائی کیے جانے کی ضرورت ہے۔ لیکن الیکشن میں تو ہمیں ملت کی بڑی تصویر دیکھنی ہے اور وہاں روز و شب کی ان الجھنوں سے کنارہ کشی کرتے ہوئے ملی فلاح کی دیرپا تاثیر کے لیے کوشاں رہنا ہے۔ آزادی کے 70 برس بعد ہونے والے 2017 کے الیکشن میں مسلمانوں کو اب یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ آخر ہم اور کب تک اپنی نمائندگی دوسروں سے (Outsource) کرواتے رہیں گے، کیا ہم ہی نے یہ نیکی کرتے رہنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، جبکہ ہم سچر کمیٹی کی رپورٹ اور اس کے بعد کے حالات کے ذریعہ جان چکے ہیں کہ مستقل ہمارے حقوق کی پامالی ہوتی چلی آرہی ہے۔ جان لیجیے کہ ملت میں اندرونی انتشار پیدا کرنے کی بھی چو طرفہ کوششیں چل رہی ہیں لیکن ہم سمجھدار ہیں اور اب ہم اس خفیہ ساز باز کا شکار نہیں بنیں گے۔ ملک میں ملت کے حق میں ہمیں خوش نما انقلاب لانا ہے، اپنا کھویا ہوا دستوری مقام ہمیں واپس حاصل کرنا ہے۔ اچھی بات ہے کہ ہندوستان کے لوگ یوگا کے ذریعہ یکجا کیے جاسکتے ہیں تو نماز بھی تو انھیں جوڑ سکتی ہے۔ اگر کسی جمہوری ملک کی پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں ایک مذہب کے ماننے والے 70 سال تک اپنی نمائندگی کسی دوسرے مذہب کے لوگوں کے ذریعہ ہی کرواتے رہیں تو اس کو جمہوریت کی خستہ حالی سمجھا جانا چاہیے۔ یہ جمہوریت کی فضیلت نہیں، بلکہ ایک طبقہ میں غلامانہ ذہنیت کی کاشتکاری ہے۔ آیئے نشست وار حکمت عملی کے ساتھ سو فیصد ووٹ کرکے کیوں نہ ہم اقبال کی پیش گوئی کو بارآور کریں:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو پلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 16 Feb-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

نظریہ

متحدہ ووٹ معصوم مسلم نوجوانوں کی آبرو

ڈاکٹر سید ظفر محمود

نجیب احمد جس کا تعلق بدایوں (یوپی) سے ہے اور وہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کا طالب علم ہے، چار ماہ سے غائب ہے۔ اس کو ڈھونڈنے کے لیے واجب کارکردگی نہیں کی جارہی ہے، باوجود اس کے کہ عدالت نے مشتبہ لوگوں کے مخصوص ٹسٹ کروانے کی تاکید کی ہے۔ لکھنؤ کے پرساد انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن کے عاکف نواز کی گمشدگی اور مدھیہ پردیش میں کھر گاؤں کے اسعد کے داڑھی نہیں منڈوانے پر اس کی برخاستگی۔ یہ اپنے آپ میں منفرد کیس ہوسکتے ہیں لیکن اس طرح کے معاملات کو جوڑ کے مجموعی طور پر غور کیا جائے تو یہ ملک میں ایک سوچی سمجھی مسلم مخالف فسطائی روش کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ فی الوقت مسلمانوں کے پاس یوپی کے ذریعہ موقع ہے کہ وہ اپنے ملک کی قسمت اپنے ہاتھ میں لے لیں لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ گزشتہ 70 برس میں ہم غلامانہ فطرت میں اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ اب ہم میں سے بہتوں کو اپنے آپ کو مسلمان کہنے میں یا ملت کے اتحاد کی بات کرنے میں الجھن محسوس ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر ہم اچھے مسلمان ہیں تو ہمیں صرف اپنے اہل وعیال کی اور صرف اپنی خاندانی زندگی کی فکر نہیں کرنی بلکہ پوری امت محمدیہؐ اور اس کی آنے والی نسلوں کی بھی بہت زیادہ فکر کرنی چاہیے۔ دوران معراج جب اللہ تعالیٰ نے حضور اقدسؐ پر سلام کے ذریعہ رحمت و برکت بھیجی تو جواب میں سرور کائناتؐ نے دعا کی کہ میرے ساتھ اللہ کے دیگر صالح بندوں پر بھی اللہ کی رحمت و برکت پہنچے۔ اس طرح رہتی دنیا تک ہمیں پیغام مل گیا کہ بقول اقبال

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

خدا کے واسطے اس کے علاوہ کسی اور سے خوف کرنا چھوڑ دیجیے، اپنی انفرادی اور اجتماعی اہمیت کو پہچانئے۔ ورنہ نجیبوں، عاکفوں اور اسعدوں کی تعداد خدانخواستہ ہزاروں اور لاکھوں میں ہوجائے گی اور یہ آگ ہمارے ذاتی گھروں کو بھی نہیں چھوڑے گی۔ انگریزی کی کہاوت ہے کہ جب زندگی میں ہو آرام تو آئیڈیا آتے ہیں۔ نجیب، عاکف اور اسعد کے اہل خاندان کے مقابلہ میں ہم آپ آرام سے ہیں تو ہمیں اللہ سے اور امت محمدیہؐ سے اتنا لگاؤ نہیں ہے جتنا کہ اُن خاندانوں کے افراد کو ہے۔ تو کیوں نہ ہم اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں اور اپنے کو تبدیل کردیں، اس طور پر ہم ملت کی قسمت کو بھی تبدیل کرسکتے ہیں۔ قرآن کریم کا پیغام ہے کہ انسان کو وہی ملے گا جس کے لیے وہ کوشش کرے گا، یعنی سعی پیہم قانون حیات ہے۔ جب ایک شخص نے سرکار دو عالمؐ سے اپنی مفلسی کی شکایت کی اور بتایا کہ اس کی کل کائنات ایک پیالہ ہے تو آپؐ نے پیالہ منگوا کے اسے نیلام کردیا اور اس رقم سے اسے ایک کلہاڑی بنوا دی اور کہا کہ لکڑیاں کاٹ کر بازار میں فروخت کرو۔ اس طرح اس شخص نے اپنے حالات میں تبدیلی کرلی اس لیے اللہ نے اس کی تقدیر بدل دی، وہ محتاج اب غنی ہوچکا تھا۔ 'بخود نا ساختن' علامہ اقبال کی اصطلاح ہے جس سے ان کی مراد ہے اپنی خودی کی مخفی طاقتوں سے بیگانگی۔ آپ نہ بھولیں کہ آپ کے اندر ایسی قوت موجود ہے جس کی بدولت آپ اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ اس مضمون کو انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

یعنی انسان اگر ہمت سے کام لے اور جدو جہد کرے تو وہ اپنی حالت بدل سکتا ہے، لیکن جب تک انسان اپنے آپ کو مجبور سمجھتا رہے گا اور تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، اس کی حالت نہیں سدھرے گی۔ اسلام ہر شخص کو جدو جہد کی تعلیم دیتا ہے، چنانچہ دین کی بنیادی تعلیم یہی ہے کہ از مہد تا لحد جدو جہد کرتے رہو۔ اسی لیے اقبال نے جدو جہد کرنے کی تلقین کی ہے اور ان کا فلسفہ پیغام عمل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تم تقدیر یزداں کا شکوہ کرنے کے بجائے خود تقدیر یزداں بن جاؤ۔ اگر تم خدا کے قانون پر عمل کروگے تو اپنی تقدیر خود بنا سکو گے۔ اس موضوع پر پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں کہ اگر آپ اپنا ہاتھ دو تین سال تک اوپر اٹھائے رہیں تو اس کی تقدیر یہ ہوگی کہ وہ سوکھ جائے گا اور اگر آپ اسی ہاتھ سے تین سال تک وزن اٹھاتے رہیں گے تو اس کی تقدیر بھی بدل جائے گی یعنی وہ طاقتور بن جائے گا۔ جب آپ عمل کریں گے تو آپ کی تقدیر مشیت الٰہی سے ہم آہنگ ہوجائے گی اور آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ نے قوت فکر، طاقت ذکر، تحرک، فنون و معجزات، گرمی گفتار جیسی نعمتوں سے مزین کررکھا ہے، ہماری زندگی جواہرات کی کان ہے اور اللہ نے یہ نعمتیں ہمیں اس لیے عطا کی ہیں کہ ہم ان کو خلق خدا کی بہبود میں استعمال کریں۔ اسلام میں مقصد حیات خدمت خلق ہے، خدمت خلق سنت انبیاء ہے اور کسی نبی نے خدمت کا معاوضہ نہیں لیا، اس لیے ہم بھی بغیر معاوضہ اگر مخلوق کی خدمت کرتے رہیں گے تو خالق کی نگاہ میں مقبول ہوجائیں گے۔

جب ملک میں الیکشن ہو تو ہماری اس بے لوث ذمہ داری میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے، سو فیصد ووٹ تو ملت کا دستوری اور دینی فریضہ ہے ہی جس کے لیے بہت پہلے سے باقاعدہ تیاری شروع ہوجانی چاہیے لیکن اس کے علاوہ ہر انتخابی حلقہ میں 10-15 خواتین و حضرات پہلے سے غور و خوض اور گفت و شنید کی بنیاد پر رائے عامہ قائم کرنے کی کوشش کریں، تاکہ ملت کے ووٹ کی اہمیت بڑھ کر اتنی ضرور ہوجائے جیسا کہ اس کا تناسب ہے۔ کیرالا اور تلنگانہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، ضروری نہیں کہ یوپی میں بھی اسی وقت فوراً ہی ماڈل لگ جائے لیکن ووٹ دیتے وقت اس ماڈل کی روح سے استفادہ تو کبھی بھی کیا جاسکتا ہے۔ مقام افسوس ہے کہ کچھ لوگ اب بھی خوف میں مبتلا ہیں کہ اگر مسلمان یکجا ہوگئے تو غیر مسلم بھی ہوجائیں گے اور وہ بڑی تعداد میں ہیں، انھیں یاد ہوگا کہ یوپی کے غیر مسلم تو 2014 میں بھی یکجا ہوگئے تھے اور ایک بھی مسلمان کو ایم پی نہیں بننے دیا گیا۔ تو کب تک غیر اللہ سے خوف کرتے رہوگے بھائی۔ گزشتہ دہلی اسمبلی الیکشن کے بعد کرن بیدی نے علانیہ طور پر مانا تھا کہ مسلم ووٹ ان کے مخالف تھا، اس لیے وہ ہار گئیں، 2012 کے یوپی اسمبلی الیکشن کے بعد وہاں سے بھی اسی طرح کا بیان آیا تھا، بہار اور بنگال کے نتیجے بھی سب پر عیاں ہیں، تو اب فی الحال کیوں کچھ لوگ ملت کے اتحاد پر خوفزدہ ہیں، ارے صرف خوف خدا کرکے تو دیکھ لیجیے۔ ہاں نشست وار حکمت عملی کا دامن بھی ضرور پکڑے رہیے۔

مسلمانوں کو بے تکے منفی نکات میں الجھانے کے باقاعدہ شاطرانہ پروگرام بھی چل رہے ہیں تاکہ ہم انہی میں پھنسے رہیں اور اپنے لیے بیحد ضروری طویل مدتی ترقیاتی ایشوز سے غافل رہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم مسلمان اگر باخبر و متحد ہوتے ہیں تو عموماً بڑی دعوتوں اور مشاعروں میں شمولیت کے وقت۔ ثقافتی طور پر اپنے کو تازہ دم کرنا بھی اچھا ہے لیکن صرف گاہے بگاہے اور وقت کی موزونیت و مناسبت کے ساتھ نہ کہ اس کے غلبہ اور تسلط کا شکار ہوکر۔ اس سماجی نقص طبع سے باہر آکر یوپی کے مسلمان چاہیں تو موجودہ الیکشن کا چیلنج قبول کرکے تدبیر کا استعمال کرتے ہوئے ملی وقار کی بازیابی کے ذریعہ پورے ملک کے سامنے مثال بن سکتے ہیں۔ ووٹ دینے کا اپنا فریضہ ادا کرکے اور اس طرح ووٹ دے کر کہ آپ کا ووٹ ملت کے دیگر ووٹوں کے ساتھ مل کر ملی فلاح کے لیے کام آجائے۔ دراصل آپ کی طرف سے ان مسلم نوجوانوں کو خراج تحسین ہوگا جو برسوں تک قید خانہ کی بیجا اذیتیں برداشت کرنے کے بعد معصوم قرار دیے جاتے ہیں۔ ہر انتخابی حلقے میں گھروں سے نکل کے عورتوں اور مردوں کے ذریعہ ووٹ ڈالتے ہوئے جوش و ولولے اور مکمل ملی اتحاد میں ان نوجوانوں کی آبرو نظر آنی چاہیے۔ □❖□

”جب ملک میں الیکشن ہو تو ہماری اس بے لوث ذمہ داری میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے، سو فیصد ووٹ تو ملت کا دستوری اور دینی فریضہ ہے ہی جس کے لیے بہت پہلے سے باقاعدہ تیاری شروع ہوجانی چاہیے لیکن اس کے علاوہ ہر انتخابی حلقہ میں 10-15 خواتین و حضرات پہلے سے غور و خوض اور گفت و شنید کی بنیاد پر رائے عامہ قائم کرنے کی کوشش کریں، تاکہ ملت کے ووٹ کی اہمیت بڑھ کر اتنی ضرور ہوجائے جیسا کہ اس کا تناسب ہے۔ کیرالا اور تلنگانہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، ضروری نہیں کہ یوپی میں بھی اسی وقت فوراً ہی ماڈل لگ جائے لیکن ووٹ دیتے وقت اس ماڈل کی روح سے استفادہ تو کبھی بھی کیا جاسکتا ہے۔“

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 09 Mar-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

’تنِ بے روح سے بیزار ہے حق‘

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

سورہ الانعام کی آیت 162 میں اللہ تعالیٰ حکم کرتے ہیں کہ یقین کرنے کے ساتھ بندہ کہے بھی کہ میری نماز اور میری ساری عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لیے ہی ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ آیت توحید کامل کی تعلیم اس طرح دیتی ہے کہ اس میں تسلیم و اطاعت اور رضا بالقضا کے ساتھ تفویض عمل بھی شامل ہے۔ ایسا کرنے سے خود مرکزیت کے بجائے انسان خدا مرکزیت کی طرف راغب ہوجاتا ہے۔ لیکن حضرت تھانویؒ کی یہ بھی تفسیر یاد رہے کہ اس خدائی حکم کی اطاعت کے لیے انسان کو خود غرضی کے بجائے دوسرے لوگوں کے لیے جینا ہوگا۔ ایسا کرنے کے لیے صرف انسانی وجود کافی نہیں ہے، بلکہ باہمت و برقی زندگی چاہیے۔ موم کو پگھلنے کے درجۂ حرارت سے زیادہ پر رکھا جائے تو اس کے پاس علاوہ پگھل جانے کے اور کوئی متبادل نہیں رہتا، لیکن انسان تو موم سے مختلف ہے اسے تو صرف موجودہ صورت حال نہیں بلکہ مستقبل پر بھی غور کرنا ہے، اس کو قدرت نے طاقت دی ہے کہ ممکنہ مقاصد میں سے اپنی پسند سے خود چن لے، اس کے لیے انسان کو خود شناس، فرض شناس، فعال اور متحرک رہنا ہوگا۔ اور انسان اپنے لیے کیا منتخب کرتا ہے، اس کے لیے اسے سماج کو بھی جواب دہ ہونا ہے اور پروردگار کو بھی، لیکن اگر وہ صرف اللہ سے خوف رکھتے ہوئے اس کی پسند کا راستہ منتخب کرلیتا ہے تو خدائی حمایت کا اس کو وعدہ ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

انسان کی ہدایت کے لیے پیغمبروں نے ابدی حقیقتوں کی بنیاد پر صحیح اور غلط راستوں کی نشاندہی کردی ہے، ایسا کرنے کے لیے انھیں سیاسی، اقتصادی یا سفیرانہ مصلحت سے کام نہیں لینا پڑا۔ ان اخلاقی اقدار کی سماج میں تعلیم کی ضرورت ہے ،خاندان میں ہر بزرگ کا فرض ہے کہ اپنے خورد کی تربیت کرے صرف بول کے نہیں بلکہ عمل کرکے۔ کوئی غیر مہذب عمل کرنے یا مذاق میں بھی اس کی بلا واسطہ ترغیب دینے سے سماج میں غلط پیغام جاتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم رول والدین اور اساتذہ کا ہے اور اکیسویں صدی میں تو میڈیا کے کندھوں پر بڑی بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ میڈیا کے کئی لوگ عوامی مسائل کے تئیں اپنا رخ اپنے ذاتی، سیاسی و اقتصادی مفاد کی روشنی میں طے کرتے ہیں۔ سیاسی رہنماؤں کا تو کیا کہنا، ان میں سے زیادہ تر کو تو سماجی کردار کے نشوونما سے متعلق اپنا فریضہ یاد ہی نہیں آتا ہے۔ اس سے بھی برا حال بین الاقوامی سطح پر ہے وہاں تو جس کی لاٹھی اسی کی بھینس کو کامیابی مانا جاتا ہے، اقوام متحدہ میں انسانی اقدار کو فروغ دینے کا شعبہ ہی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ساری خرابی بچے کی پرورش سے شروع ہوتی ہے اور وہیں پر بزرگوں کو فرض شناس ہونے کی ضرورت ہے۔ بہت کم عمری میں ہی انسان کو سنگدلی سے باہر نکالنے کے جتن کیے جاسکتے ہیں، اسی وقت اس کو روحانیت کی طرف مائل کیا جاسکتا ہے۔ تبھی اقتدار، حاکمیت، نسل، رنگ، مذہب، ذات کی بنیاد پر تعصب اور طرفداری کے پاتال سے نکال کر آگے آنے والے سماج کو وسیع النظری کی طرف مائل کیا جاسکتا ہے۔

> **”سیاسی رہنماؤں کا تو کیا کہنا، ان میں سے زیادہ تر کو تو سماجی کردار کے نشوونما سے متعلق اپنا فریضہ یاد ھی نہیں آتا ھے۔ اس سے بھی برا حال بین الاقوامی سطح پر ھے وھاں تو جس کی لاٹھی اسی کی بھینس کو کامیابی مانا جاتا ھے،اقوام متحدہ میں انسانی اقدار کو فروغ دینے کا شعبہ ھی نہیں ھے۔ معلوم ھوا کہ ساری خرابی بچے کی پرورش سے شروع ھوتی ھے اور وھیں پر بزرگوں کو فرض شناس ھونے کی ضرورت ھے۔“**

سورہ الرحمٰن کی آیت 29 میں اللہ تعالیٰ اپنے لیے فرماتے ہیں کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتے ہیں۔ مولانا عبد الماجد دریابادی تشریح کرتے ہیں کہ یعنی کائنات میں جو تصرفات ہر لحظہ اور ہر آن جاری رہتے ہیں وہ نتیجہ ہیں اللہ کی ہمہ وقتی توجہ اور التفات کا، یہ ممکن نہیں کہ اللہ پر غفلت یا بے التفاتی ایک آن کے لیے بھی طاری ہو۔ کائنات کی ادنیٰ سی حرکت میں بھی قادر مطلق کی کن فیکونی قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ خدا اپنی خلاّقی اور فعّالی کی تجلیات مستقل دکھاتا رہتا ہے۔ قرآن کریم میں فعل اور عمل کا استعمال مختلف صیغوں میں ملا کر 500 سے زائد مقامات پر آیا ہے۔ دوسری طرف سورہ صٓ کی آیت 72 میں تخلیق آدم کا طریق کار بیان کرتے ہوئے اللہ میاں کہتے ہیں کہ انسان کے اندر ڈالی گئی روح خود اللہ کی نسبت سے مکرم و مشرف ہے۔ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق انسانی کی تکمیل دو امور پر موقوف ہے، پہلے تسویہ جسد اور پھر نفخ روح۔ اس طرح انسان کو عظیم ذمہ داری دے دی گئی کہ وہ اپنے اندر روح ایزدی کا حق ادا کرنے کے لیے اپنے پروردگار کی مستقل متحرک رہنے کی صفت کا استعمال کرکے اپنی تخلیق کا حق ادا کرتا رہے۔ اس پس منظر میں آیئے ہم وطن عزیز میں اپنی بے عملی پر غور کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا دین پانچ بنیادی ستونوں پر ختم ہوجاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں سے ہمارا دین شروع ہوتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم یہ سمجھے کہ امتحان کی تیاری اور خود امتحان ہی تمام تدریس و تعلیم کا اصل مقصد ہے تو وہ خسارہ میں رہے گا، اسے سمجھنا ہوگا کہ اس کا اصل مقصد ہے کردار سازی اور قابلیت پر مبنی خود مختاری، جس سے لیس ہوکر اس میں خود اعتمادی اور خود وثوقی پیدا ہوگی، تاکہ وہ ملک و دنیا کے بڑے چیلنج قبول کرسکے۔ اسی طرح جامعہ الاظہر کے پروفیسر امریٹس ڈاکٹر فتح عثمان مرحوم و مغفور اپنی مشہور کتاب ’قرآن کے بنیادی تصورات‘ میں لکھتے ہیں: نماز سے استفادہ کی پہچان یہ ہے کہ بندہ دو نمازوں کے درمیان جب مسجد سے باہر ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے۔ یہی طریق کار باقی چاروں ستونوں سے استفادہ آنکنے کا بھی ہے۔ اجتماعی عبادت کے دوران ایک مرکزی نکتہ پر مکمل توجہ مرکوز کرکے تمام عابد اپنے دل کے غار حرا میں داخل رہتے ہوئے اندرون قلب کو ایک اضطرار واحد سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس سے وہ ابدی حقیقت فروغ پاتی ہے جو ذہنی انتشار کو یکجا کرنے کی طاقت رکھتی ہے اور اس طرح ایک خاموش قوت پروان چڑھتی ہے جو عملی جامع میں آنے کے لیے بیتاب رہتی ہے۔ جب عابد سجدہ میں ہوتے ہیں تو اپنے کو مالک کائنات سے قریب تر محسوس کرتے ہیں، تمام زندگی میں سجدہ کا ہی لمحہ ایسا ہوتا ہے جب دل کی سطح دماغ کی سطح سے اونچائی پر ہوتی ہے، اس حالت میں مرکزی نکتہ سے جڑی ہوئی تمام ترنگیں یہ بھی احساس رکھتی ہیں کہ اس کام میں اجتماعیت کی برکت بھی شامل ہے۔ لیکن اصل دین اس کو بھی آخری شرعی مقصد حیات نہیں مانتا ہے، وہ تو اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ دین کے پانچ بنیادی ستونوں سے حاصل شدہ جذبہ اطاعت و اجتماعیت سے سرشار مومنین کا فریضہ ہے کہ اس سافٹ ویئر (Software) کو ہارڈ ویئر (Hardware) میں تبدیل کرتے رہیں جس سے وہ مستقلاً متحرک رہ کر سماج کے دیگر اور خصوصاً ہر طرح کے ضرورت مند اشخاص کی اپنے دل و دماغ اور ہاتھ پیر کے ذریعہ اور جہاں تک ممکن ہو اجتماعیت سے امداد کرتے رہیں۔

لوک سبھا الیکشن 2019 اور اس کے پہلے متعدد صوبوں میں اسمبلی الیکشن کی تیاری کے لیے دن گھٹتے جارہے ہیں، ہر سانس پر گھڑیال ہمیں خبردار کررہا ہے کہ گردوں نے مہلت کی ایک اور گھڑی گھٹا دی۔ میرے 12 جون کے مضمون ’2019 کے لیے ہمارا نقشہ راہ (Roadmap)‘ میں ترکیب درج ہے کہ ملک میں اور بیرون ملک کہیں بھی بیٹھے ہوئے، ملت اسلامیہ ہند کے مستقبل کو اندھیروں سے بچانے کے لیے، ہر مرد و عورت کے ذریعہ کتنا زیادہ کام ممکن ہے۔

ایک اور متبرک اتفاق یہ ہے کہ اس وقت ملک کے قابل ترین گریجویٹ و پوسٹ گریجویٹ نوجوانوں کے لیے بھی یہ فیصلہ کی گھڑی ہے کہ وہ مئی 2015 میں منعقد ہونے والے سول سروسز پریلم امتحان میں شامل ہوں گے کہ نہیں۔ ہچکچانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، ایڑ لگایئے آپ اپنے کو خندق کے پار پائیں گے ان شاء اللہ۔ بس آستین چڑھا کے جہانِ مکافات میں اتر پڑیے۔ یو پی ایس سی کی ویب سائٹ پر جاکر سول سروسز سے متعلق سب مواد کئی دفعہ پڑھیے، نوٹس (Notes) بنایئے، کئی دفعہ غور و خوض کیجیے، آپ کا دل و دماغ بتا دے گا کہ آپ کو کس طرح اور کتنی محنت کرنی ہے اور روزہ رکھ کے یہ کام زیادہ پرجوش طریقہ سے ہوگا۔ 2019 کے الیکشن سے قبل یو پی ایس سی کے ذریعہ سول سروسز کے جو نتیجے نکلیں ان میں کامیاب مسلمانوں کی تعداد اب کے مقابلہ میں آسانی سے دوگنی کی جاسکتی ہے۔ بقول اقبالؔ، قلب سلیم رکھنے والا شخص اپنی طاقت کو پرکھنے کے لیے اولوالعزمی والے کام اپنے ذمہ لیتا ہے۔

◻❖◻

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

آئینہ......ضمیر ہاشمی

الیکشن کا نتیجہ جو بھی اب یو پی میں آئے گا
مگر لکھنؤ نے کچھ گجرات سا منظر دکھایا ہے
وہ ٹھاکر گنج میں مڈبھیڑ کا تھا شور و ہنگامہ
الٰہی خیر شہرِ امن پر منحوس سایا ہے

Published in 16 Mar-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

آئیے خستہ حال ملت کو تازہ دم کریں

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

میں نے 22 جنوری کو ایک ویڈیو میں یوپی کے مسلم ووٹروں سے اپیل کی تھی کہ مسلم ووٹ 100 فیصد پڑنا چاہیے اور مسلمان متحد ہو کے ووٹ دیں، بہت لوگوں نے میری اپیل کو پسند کیا لیکن پیغام کو شاید آگے کم بڑھایا اور کچھ نے کہا کہ اس طرح تو اغیار کا ووٹ بھی متحد ہوجائے گا، آیئے اب پوسٹ مارٹم کرلیں جس کا اصل مقصد ہوتا ہے ایسی تفتیش وطبی تحقیقات تاکہ آئندہ ان مہلک امراض کا بہتر علاج ہوسکے۔ اس سے قبل اور اس کے بعد بار بار قارئین کو میں یاددلاتا رہا ہوں کہ یوپی میں 68 اسمبلی نشستیں ایسی ہیں، جہاں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق مسلم ووٹ 78-35 فیصد ہے اور 89 سیٹوں میں مسلم ووٹ 30-20 فیصد ہے۔ ان سیٹوں کے نام بھی میں نے اپنے گزشتہ مضامین میں پیش کیے ہیں۔ اگر ہم متحد ہو جاتے تو وہاں یا تو مسلمان امیدوار یا مسلمانوں کی توہین نہ کرنے والے دیگر امیدوار جیت سکتے تھے۔ ایسا نہیں کیا گیا اور نتیجتاً صوبہ کی آبادی کا پانچواں حصہ دودھ کی مکھی بن گیا۔ کیا اسی لیے اللہ نے ہمیں مسلمان بنایا ہے کہ ہم لاپروائی اور ڈھیٹ پن سے اپنی بھی بھد اڑوائیں اور باقی ملت کو بھی شرمندہ کریں۔ یوپی کے ان تمام مسلم ووٹروں کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا ہوگا، جنھوں نے ووٹ نہیں دیا اور دیا تو لاپروائی کے ساتھ اور ملی مفاد کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ووٹ دیا اور جنھوں نے ذاتی مفاد کو ملی مفاد پر برتر مانا ان سے تو اللہ ہی سمجھے گا۔ ہمیں اپنا قومی مزاج بدلنا ہو گا۔ ہم میں سے جو لوگ عمر کی آخری تہائی میں داخل ہو چکے ہیں، ان کو خاص طور پر متحرک ہونا پڑے گا، ان کے علاوہ ہر عمر کے لوگوں کو اپنے کام کاج میں سے ہی ملت کے لیے روز وقت نکالنا ہوگا۔ چلیے آسانی کے لیے ہم انھیں کیمیا گر کا نام دے دیں، اُن کے ذریعہ ملت کو ملک میں اپنے مقام کی نشوونما اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی اور اس کو بنانے، سنوارنے اور پروان چڑھانے کا کام خود کرنا ہوگا۔ لیکن اس انقلابی مہم میں شامل ہونے والے ہر شخص کو شروع سے آخر تک ذاتی طور پر اپنے کو ہمیشہ ملت سے کمتر سمجھنا ہوگا، اس کام میں ذاتی انا کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا ہے۔ کیمیا گر (Alchemist) اقبالیات کی اصطلاح ہے، جس کا مفہوم ہے کچے تانبے کو سونے میں تبدیل کرنے والا۔

”اگر ہم متحد ہوجاتے تو وہاں یا تو مسلمان امیدوار یا مسلمانوں کی توہین نہ کرنے والے دیگر امیدوار جیت سکتے تھے۔ ایسا نہیں کیا گیا اور نتیجتاً صوبہ کی آبادی کا پانچواں حصہ دودھ کی مکھی بن گیا۔ کیا اسی لیے اللہ نے ہمیں مسلمان بنایا ہے کہ ہم لاپروائی اور ڈھیٹ پن سے اپنی بھی بھد اڑوائیں اور باقی ملت کو بھی شرمندہ کریں۔ یوپی کے ان تمام مسلم ووٹروں کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا ہوگا۔“

تمام انتخابی حلقوں میں وہاں کے کیمیا گروں کو بے غرضی سے متحرک ہو کر بے لوث لیڈرشپ کا رول ادا کرنا ہوگا۔ آپ اپنے انتخابی حلقہ میں 12-10 اشخاص پر مشتمل ایک گروپ کی فوراً تشکیل کرلیں، اس کو KGP (کیمیا گر پولیٹیکل) نام دیا جاسکتا ہے اس کے دفتر کے لیے اپنے گھروں میں ہی کہیں فی الحال ایک کمرے کو مقرر کر دیں اور کام شروع کر دیں۔ اپنے انتخابی حلقہ میں مسلمانوں کی صحیح تعداد اور کل آبادی کا مسلم فیصد مردم شماری کے قومی رجسٹرار یا الیکشن کمیشن کی ویب سائٹ سے معلوم کرلیں۔ پھر قومی، صوبائی اور مقامی سطح پر مسلمانوں کے مسائل سے تفصیلی آشنائی کرلیں اور ان مسائل کے ممکنہ حل پر کام کرنا شروع کردیں۔ ایک پنج سالہ منصوبہ بنائیں اور پانچ عدد سالانہ منصوبے۔

اگلا پارلیمانی الیکشن ڈھائی برس بعد ہوگا۔ اسمبلی کے اور میونسپل کارپوریشنوں، میونسپل بورڈوں اور پنچایت کے الیکشن تو ملک میں وقتاً فوقتاً ہوتے ہی رہتے ہیں۔ بہرحال کیمیا گروں کا یہ گروپ ڈیڑھ دو برس کے اندر ہی اتنا ٹھوس کام مسلمانوں کے حق میں کرچکا ہو اور مسلمانوں کو اس گروپ پر اتنا زبردست اعتماد ہوچکا ہو کہ اب جب بھی اگلا الیکشن ہو تو جس امیدوار کو اور جس پارٹی کو یہ گروپ کہے گا، اسی کو مسلمان ایک جٹ ہو کر اپنا ووٹ دیں۔ ساتھ ہی اس گروپ کے افراد علاقہ کے قابل ترین نویں سے بارہویں جماعت کے طلبا کی نشاندہی کرکے انھیں ابھی سے سول سروسز کی طرف مائل کرنے اور ابھی سے انھیں روز 3 گھنٹے اس کی تیاری میں لگانے کے لیے معقول ادارہ سازی کی تگ ودو کریں۔ یہ بچے روز اسکول یا کالج جائیں شام کو کھیلیں بھی لیکن پڑھائی اور ہوم ورک کے علاوہ روز 3 گھنٹے لگا کر مستقبل کے سول سروس امتحان کی تیاری کے لیے 3 اضافی کام کریں۔ این سی ای آر ٹی کی سائنس، حساب، انگریزی اور سماجیات کی نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کی 16 کتابیں (NCERT class 9th to 12th books of Science, Maths, English and Social Studies) ہر بچے کو دی جائیں اور ان کی دیکھ بھال و کفالت کرنے والے صاحب (کیمیاگر) بھی اپنے پاس ایک ایک سیٹ رکھیں گے۔ ان 16 کتابوں کی پڑھائی ان بچوں کو اگلے 5 برس میں کرنی ہے۔ اگر ایک کتاب کا ایک سبق (Lesson) بچے تین روز تک ایک ایک گھنٹہ پڑھیں گے اور اس پر ڈائریکٹر کی موجودگی میں بچوں کا ہفتہ وار تبادلہ خیال ہوجائے اور اس پر بچے اپنے رجسٹر میں نوٹس (Notes) تیار کرلیں تو پوری عمر کے لیے وہ مضمون ان کے ذہن کے دریچوں میں جذب ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ سول سروس امتحان کے لیے معلومات عامہ (General Studies) کی ایک ایک کتاب ٹی ایم ایچ یا پیئرسن (TMH or Pearson) کی ہر بچہ کو مہیا کی جائے۔ اس کتاب میں سے ہر بچہ ہر دن تھوڑا سا پڑھ کر یاد کرلے۔ مثلاً دنیا کے تمام ممالک اور ہندوستان کے تمام صوبوں کے دارالحکومت کا نام، دنیا و ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں اور ان کے حرف تحریر (Script) کے نام وغیرہ۔ اس کتاب کے اجزا کو بھی 5 برس کے وقفہ میں تقسیم کیا جائے۔ تیسرے اضافی کام کے لیے انگریزی روزنامہ ہندو بچہ کو بلاناغہ مہیا کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک کاپی ڈائریکٹر کے گھر پر بھی آئے، روز اس کا بڑے انہماک سے مطالعہ ہو۔

بچہ کو آکسفورڈ یا کیمبرج کی بڑی ڈکشنری اور ایک ایک موٹا سا مضبوط رجسٹر دیا جائے جس میں بچہ خود پہلے سے ہی ہر پیج پر نمبر ڈال دے۔ شروع کے 10 پیج فہرست مضامین (Index) کے لیے چھوڑ دیے جائیں۔ اخبار کا روز جو سنجیدہ مطالعہ ہو اس سے متعلق نوٹس (Notes) اس رجسٹر میں بچہ لکھے اور اس تحریر کا فہرست مضامین میں اندراج بھی کرے۔ اس رجسٹر میں موجود مواد کی بنیاد پر بچہ ہر پندرہ روز پر کسی ایک متعلقہ عنوان پر ایک مضمون بھی لکھے۔ ایک الگ رجسٹر میں روز پڑھے جانے والے نئے انگریزی الفاظ کے معنی ڈکشنری میں دیکھ کر لکھے جائیں، معنی کے ساتھ اس لفظ کی تاریخ اور اس کے نشوونما (Etymology) کا بھی اندراج کیا جائے۔ اس طرح حاصل شدہ علم کی روشنی میں ہر ماہ بچوں کا مقابلہ بھی ہوا کرے، جس میں جیتنے والے بچہ کو انعام سے نوازا جائے۔ بڑوں کی نگرانی میں ٹی وی، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا بھی انتظام ہو۔ یہ بچے اپنا پلس ٹو Plus Two پاس کریں گے پھر گریجویشن کریں گے اور پھر یہ سول سروس کے امتحان میں حصہ لیں گے۔ اس طرح 5 برس کی طویل تیاری کے بعد ممکن نہیں ہے کہ ان بچوں کو سول سروس کے امتحان میں کامیابی نہ ملے۔ یہ بھی طے ہے کہ اس نکتہ بہ نکتہ وسیع و جامع تیاری کے بعد یہ بچے کسی بھی ٹسٹ یا انٹرویو میں نمایاں کامیابی ان شاء اللہ ضرور حاصل کرسکیں گے۔ یاد رکھیے کہ اس سہولت کا اصل مقصد صرف ملت کے نوجوانوں کو روزگار دلوانا نہیں ہے بلکہ اس مہم کا اصل مقصد ہے پوری ملت کو بااختیار بنانا، ایمپاور (Empower) کرنا ہے۔ یہی بچے حکومت کی کرسیوں پر بیٹھیں گے، یہی ضلعوں میں الیکشن کے حکام ہوں گے، یہ ووٹنگ مشینوں کے ذریعہ گڑبڑی نہیں ہونے دیں گے، یہ لاء کمیشن میں سکریٹری ہوں گے اور کسی طبقہ کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔ وزارت تعلیم میں سکریٹری بنیں گے اور مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ختم نہیں ہونے دیں گے۔ پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر بیٹھیں گے اور بیجا انکاؤنٹر نہیں ہونے دیں گے، وغیرہ۔ KGP اور KGA کی بے غرض کارکردگی کی بنا پر جلد ملت کے حق میں ان شاء اللہ ملک گیر مثبت اثرات نظر آنا شروع ہوجائیں گے۔ پھر ہم ملی فلاح کی اسکیموں کے نفاذ کے لیے افسر شاہی پر اثر انداز ہوسکتے ہیں اور اپنے آئینی حقوق کی استواری کو یقینی بنا سکتے ہیں۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

آئینہ......ضمیر ہاشمی

الیکشن میں اپیلوں نے دیے ہیں زخم جو ہم کو
ابھی تو ان پہ مرہم بھی نہیں رکھ پا رہے ہیں ہم
اب اس کے بعد فتووں کا نیا جو دور جاری ہے
نتائج اس روش کے سوچ کر گھبرا رہے ہیں ہم

ایم سی ڈی الیکشن، بابری مسجد، سپریم کورٹ اور ہم

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

اگر آپ دہلی کے باشندے ہیں اور یکم جنوری 2017 کو آپ کی عمر 18 برس یا اس سے زیادہ ہوچکی تھی تو آپ ایم سی ڈی الیکشن 2017 میں ووٹ دینے کے حق دار ہیں۔ اگر ابھی تک آپ نے اپنے کو ووٹر کے طور پر رجسٹر نہیں کروایا ہے تو فوراً آپ دہلی الیکشن کمیشن کی ویب سائٹ ceodelhi.nic.in پر جائیں اور اپنے کو ووٹر کے طور پر رجسٹر کروائیں۔ اگر آپ پہلے سے ہی ووٹر ہیں اور آپ کے پاس ووٹر آئی ڈی کارڈ ہے تب بھی آپ دہلی الیکشن کمیشن کی ویب سائٹ پر چیک کریں کہ ووٹر لسٹ میں آپ کا نام درج ہے کہ نہیں کیونکہ اگر وہاں نام نہیں ہے تو آپ کے پاس ووٹر آئی ڈی کارڈ ہونے کے باوجود آپ ووٹ نہیں دے سکیں گے۔ والدین، بڑے بہن بھائی، چچا چچی، ماموں ممانی، اساتذہ، ائمہ، مؤذن صاحبان وغیرہ اپنے چھوٹوں اور دیگر افراد کو بار بار ٹوکیں کہ اپنے کو ووٹر بنا لیا کہ نہیں۔ اگر آپ نے گھر تبدیل کیا ہے تو اس کے لیے بھی دہلی الیکشن کمیشن کی ویب سائٹ پر خود ہی اندراج کرنا ہوگا۔ آپ اپنے پولنگ اسٹیشن کی شناخت بھی کرسکتے ہیں۔ الیکشن ضابطے کے نفاذ سے متعلق اگر آپ کو کوئی شکایت ہے تو آپ اسے بھی آن لائن درج کرسکتے ہیں۔ حکومت کے موجودہ و رٹائرڈ ملازم اپنے کو بوتھ لیول افسر کے طور پر تقرری کروانے کے لیے اسی ویب سائٹ پر جائیں۔ امام وخطیب صاحبان سے اپیل ہے کہ یہ ساری اطلاع جمعہ کے خطبے کے ذریعہ مقتدی صاحبان تک پہنچائیں۔ خواتین تک بھی یہ اطلاعات پہنچنا بیحد ضروری ہے۔

دہلی کے الیکشن کمیشن کو دس صفحہ کا نوٹس دے دیا گیا تھا یہ لکھتے ہوئے کہ 2012 میں وارڈوں کی حدبندی ضابطہ کے خلاف ہوئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ وارڈوں کی حدبندی میں خاطر خواہ تبدیلیاں کریں، بعد میں اسی ضمن میں چار دیگر نوٹس دہلی الیکشن کمشنر کو دیے گئے۔ جس کے بعد دہلی کے وارڈوں کی حدبندی میں کافی حد تک خوش آئند ترمیمات الحمد للہ کر دی گئی ہیں جس کی بنیاد پر تازہ حدبندی نوٹیفکیشن 13 جنوری 2017 کو جاری کردیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس کا مثبت اثر ملت کی نمائندگی سے متعلق ایم سی ڈی الیکشن کے نتیجوں میں نظر آئے گا۔ پھر بھی ان نکات میں سے تقریباً ایک تہائی پر دہلی کے الیکشن کمشنر نے عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے ان نکات پر دہلی ہائی کورٹ میں پٹیشن داخل کردی گئی ہے۔ کوشش ہے کہ ان ایک تہائی نکات پر بھی الیکشن کمیشن کی کارروائی ابھی ہی ہو جائے لیکن کیونکہ اس درمیان ایم سی ڈی الیکشن کی کارکردگی شروع ہوچکی ہے اس لیے ممکن ہے کہ ان ایک تہائی نکات کا اثر اگلے الیکشن پر ہی پڑے۔

ایم سی ڈی کے وارڈوں کی حدبندی میں جو تبدیلیاں کروائی جاسکی ہیں، ان میں شامل ہیں شیڈولڈ کاسٹ کی کم ترین آبادی والے وارڈوں کو ریزرویشن سے آزاد کروا کے کثیر ترین شیڈولڈ کاسٹ آبادی والے وارڈوں کو ریزرو کروانا۔ 2012 میں دہلی الیکشن کمیشن نے ہر اسمبلی حلقہ میں ایک ایک وارڈ ریزرو کیا تھا جبکہ شیڈولڈ کاسٹ کی آبادی ہر اسمبلی حلقہ میں برابر سے منقسم نہیں ہے۔ ضابطہ کے مطابق وہی وارڈ ریزرو ہونے ہیں جہاں شیڈولڈ کاسٹ آبادی سب سے زیادہ ہے، چاہے کسی اسمبلی حلقہ میں ایک سے زیادہ وارڈ ریزرو کرنے پڑیں تب بھی اور چاہے کسی اسمبلی حلقہ میں ایک بھی وارڈ نہ ریزرو ہو تب بھی۔ 2012 میں گوتم پوری کی بہت سی آبادی کو سیلم پور میں شامل کردیا گیا تھا جو کہ اب واپس گوتم پوری میں ضم کردیا گیا ہے۔ بابر پور اسمبلی حلقہ میں تین ہی وارڈ رکھے گئے تھے جب کہ اس سے کم آبادی والے اسمبلی حلقوں میں چار وارڈ رکھے گئے تھے۔ اب الیکشن کمیشن نے بابر پور میں چار وارڈ کردیے ہیں۔ سونیا وہار کی 12 ہزار سے زیادہ کی آبادی کو کاٹ کے شری رام کالونی میں جوڑ دیا گیا تھا، جو کہ اب تجویز کو مانتے ہوئے واپس کردیا گیا ہے۔ مردم شماری 2011 کے مطابق 60,000 آبادی پر ایک وارڈ بننا چاہیے جس میں ضابطہ کے لحاظ سے تحریری نکات کی بنیاد پر دس سے پندرہ فیصد کمی بیشی ہوسکتی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن کئی وارڈوں میں اس رول کی خلاف ورزی نظر آرہی تھی، جو کہ اب درست کردی گئی ہیں۔

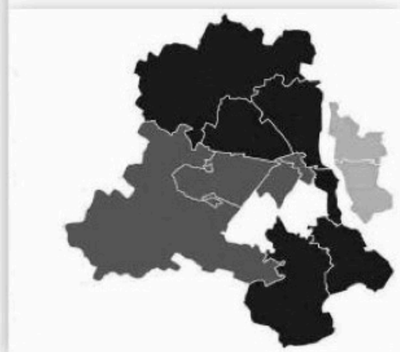

اب اگر دہلی میں ایم سی ڈی کے ووٹر خواتین وحضرات وہ غلطیاں نہ کریں جو یوپی کے ووٹروں نے حال میں ہی کی ہیں تو نتائج کافی سازگار ہوسکتے ہیں۔ میری اپیل ہے کہ ہر وارڈ میں ذی فہم خواتین وحضرات ابھی سے اس معاملہ میں باہمی گفتگو شروع کردیں۔ جہاں جس ملی امیدوار کے جیتنے کے آثار ہوں، سب مل کے اسی کو ووٹ دیں۔ اگر ایسی امید نہ ہو تو جس غیر فرقہ پرست امیدوار کے جیتنے کے آثار ہوں سب مل کے اسی کو ووٹ دیں۔ پارٹیوں کے درمیان بھی حکمت عملی سے کام لیجیے۔ خدا کے واسطے ایم سی ڈی کو انفرادی خودغرضی کی سیاست پر بھینٹ مت چڑھنے دیجیے۔ یاد رکھئے کہ آنے والے الیکشن میں سو فیصد ووٹ پڑنا چاہیے اور ووٹ متحد رہنا چاہیے۔ بقول مسلم عثمانی:

اب تو بیساکھیوں کی ہوس چھوڑ دو
اب تو مانگی ہوئی روشنی سے بچو

ادھر بابری مسجد شہادت کیس میں سپریم کورٹ نے موقع دیا ہے کہ فریقین عدالت سے پرے ایک دفعہ اور گفتگو کرلیں کہ شاید مصالحت کی کوئی صورت حال نکل آئے۔ اس پر ملت سے متعدد قسم کے ردعمل آئے ہیں۔ غالباً عدالت سے ہٹ کے کوئی حل نہیں ہوسکے گا اور عدالت ہی کا حرف آخر رہے گا، خدا کرے ملت کے حق میں فیصلہ ہو، آمین۔ لیکن فی الحال عدالت کا دیا ہوا یہ موقع مسلمانوں کو اپنی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ اگر ان کے کہنے کے مطابق فیصلہ کیا جائے، لیکن چند شرائط پر: (i) لوک سبھا اور اسمبلیوں کے ان انتخابی حلقوں کو جن میں مسلم آبادی بہت زیادہ ہے اور شیڈولڈ کاسٹ کی آبادی بہت کم ہے، انھیں ریزرویشن سے آزاد کیا جائے۔ (ii) ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلہ کے لیے متبادل معیار (Alternate Admission Criteria) اختیار کیا جائے جیسا کہ سچر کمیٹی نے سفارش کی ہے۔ (iii) صوبائی وقف بورڈوں میں سی ای او کے عہدے کے لیے انڈیا وقف سروس قائم کی جائے، جس کی سفارش سچر کمیٹی نے کی ہے۔ (iv) بینکوں میں غیر سودی مالیات کی کھڑکی کھولنے کی ریزرو بینک آف انڈیا کی تجویز کو مرکزی حکومت تسلیم کرلے۔ (v) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو مرکزی حکومت تسلیم کرلے۔ (vi) ہر اس شخص کو جس پر دہشت گردی کا الزام لگے اور اس الزام کی وجہ سے وہ برسوں تک اذیتیں برداشت کرے، لیکن بعد میں وہ عدالت سے باعزت بری ہوجائے، اسے حکومت کی طرف سے پچاس لاکھ روپے کا معاوضہ دیا جائے۔ بعد میں یہ رقم ان سرکاری ملازموں کی تنخواہ، پنشن، پروویڈنٹ فنڈ اور ریٹائرمنٹ بنفٹس سے حکومت وصول کرلے۔ (vii) مرکزی وصوبائی حکومتوں کے تحت عہدوں اور تقرریوں میں دستور ہند کی دفعہ 16 اور سچر کمیٹی کی سفارش کے مطابق مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نامزد کیا جائے۔ (viii) مرکز اور صوبوں میں مساوی مواقع کمیشن (Equal Opportunity Commission) قائم کیے جائیں، جیسا کہ سچر کمیٹی نے سفارش کی ہے۔ ہماری ان شرائط کو وہ یا تو مانیں گے یا نہیں مانیں گے۔ اگر مان لیتے ہیں تو آزاد ہندوستان میں اس سے بڑی جیت مسلمانوں کی ہوئی نہیں اور اگر نہیں بھی مانتے ہیں تو مسلمانوں کا یہ کلیدی نقطہ نظر میڈیا کے ذریعہ منظر عام پر آجائے گا اور عقدہ کھل جائے گا کہ ہمیں مندر مسجد میں الجھا کے اس کی آڑ میں ہمارے اصلی حقوق کی پامالی چل رہی ہے اور اس طرح ملک کے بہت بڑے طبقے کے ذہنوں میں ہمارے لیے ہمدردی اور بڑھ جائے گی جو کہ آگے چل کے کبھی بھی کام آسکتی ہے۔

□❖□

مردم شماری 2011 کے مطابق 60,000 آبادی پر ایک وارڈ بننا چاہیے جس میں ضابطہ کے لحاظ سے تحریری نکات کی بنیاد پر دس سے پندرہ فیصد کمی بیشی ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن کئی وارڈوں میں اس رول کی خلاف ورزی نظر آرہی تھی، جو کہ اب درست کر دی گئی ہیں۔

آئینہ......ضمیر ہاشمی

عدالت بھی اگر حق فیصلہ کرنے سے ڈرتی ہو
تو پھر کمزور کو ناحق پہ ہی مجبور ہونا ہے
ثبوتوں سے، دلیلوں سے وہاں کچھ بھی نہیں ہوگا
جہاں پر آستھا کے سامنے انصاف بونا ہے

Published in 30 Mar-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

الیکٹرانک ووٹنگ مشین و جمہوریت کے اندیشے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

لوک سبھا اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کے لیے مرکزی الیکشن کمیشن بنگلور کی بھارت الیکٹرانکس لمیٹڈ اور حیدرآباد کی الیکٹرانکس کارپوریشن آف انڈیا لمیٹڈ سے الیکٹرانک ووٹنگ مشینیں حاصل کرتا ہے۔ یہ دونوں کمپنیاں مرکزی سرکار کے مخصوص دائرہ اختیار و تسلط میں آتی ہیں نہ کہ الیکشن کمیشن یا متعدد سیاسی پارٹیوں کے متحدہ کنٹرول میں۔ میونسپل کارپوریشنوں اور دیگر مقامی و بلدیاتی اداروں میں الیکشن کے لیے ووٹنگ مشینیں حاصل کرنا صوبائی الیکشن کمشنر کے دائرۂ کار میں آتا ہے، وہ مشینیں کہاں سے آتی ہیں یہ مزید تحقیق کا معاملہ ہے۔ ووٹروں کو یہ بھی معلوم ہونا ضروری ہے کہ ووٹنگ مشینیں حاصل کرنے کے بعد ان کو سنبھال کر رکھنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کے عمل کے دوران یہ مشینیں طرح طرح کی دست درازی یا ہیر پھیر سے محفوظ ہیں کہ نہیں۔ ہمارے ملک میں ووٹنگ مشین کے دو حصے ہوتے ہیں، بیلٹنگ یونٹ (Balloting Unit) پر ووٹر کو بٹن دبانا ہوتا ہے اور پانچ فٹ لمبے تار کے ذریعہ کنٹرول یونٹ (Control Unit) کی لگام پولنگ بوتھ کے پریزائڈنگ افسر کے پاس ہوتی ہے۔ مشین کے یہ دونوں حصے اندرونی طور پر آپس میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک مشین سے زیادہ سے زیادہ 3,840 ووٹ پڑ سکتے ہیں۔ ووٹنگ مشین کے استعمال سے قبل ہر ووٹر کو کاغذ کا ایک بیلٹ دیا جاتا تھا اور اس کے بعد اس کے ووٹ ڈالنے کی کارروائی پر کسی کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا تھا۔ اس دستی بیلٹ کی جگہ اب مشین کے بٹن نے لے لی ہے جس کو دبانے سے تبھی ووٹ پڑ سکے گا، جب پریزائڈنگ افسر نے پہلے سے مشین کی لگام کے ذریعہ اس کو ایسا کرنے کے قابل بنایا ہو۔ یاد رہے کہ ووٹر کے ذریعہ بٹن دبانے پر اگر اس کا ووٹ پڑ گیا تو لال رنگ کی ایل ای ڈی روشنی جلنی چاہیے اور اس کے ساتھ ایک سیٹی بجنے کی آواز بھی آنی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ووٹ نہیں پڑا، ایسی صورت حال میں پریزائڈنگ افسر سے بات کرکے اس کے پاس لگام کے ذریعہ مشین کو کمانڈ بھجوا کے بٹن پھر سے دبانا چاہیے۔ اب ذرا غور کریں کہ کروڑوں ناخواندہ خصوصاً دیہی علاقوں کے ووٹروں کو کیا یہ سب معلومات حاصل ہیں اور کتنے امکانات ہیں کہ وہ سمجھتے ہوں کہ ان کا ووٹ پڑ گیا، لیکن دراصل ایسا ہوا نہیں۔ لہٰذا تحقیق کرنی ہوگی کہ ووٹ ڈالنے کی کارروائی کے شروع میں پریزائڈنگ افسر کے بٹن دبانے کے اختیار سے کس حد تک اعلیٰ جمہوری اقدار پر حرف آتا ہے۔ ساتھ ہی کیونکہ ووٹنگ مشین میں زیادہ سے زیادہ ووٹ کے نمبر پر روک ہے، اس لیے یہ معلوم ہونا آسان ہے کہ کس مشین سے کتنے ووٹروں نے کس امیدوار کو ووٹ دیے، لہٰذا جیتنے والے امیدوار کے پاس یہ اطلاع بعد میں اس کے انتخابی حلقہ کے مختلف علاقوں میں مساوی ڈیولپمنٹ پر منفی اثر ڈال سکتی ہے۔ حال میں ایک سوال کے جواب میں مرکزی الیکشن کمیشن نے بتایا ہے کہ فیکٹری میں بنائے جانے کے دوران فیکٹری عملہ کے ذریعہ پلان کے مطابق مشینوں کی کارکردگی کی وقتاً فوقتاً جانچ ہوتی رہتی ہے۔ ان کمپنیوں کے اندر ہی کوالٹی اشیورنس گروپ کے ذریعہ ووٹنگ مشینوں کی جوق در جوق چیکنگ ہوتی ہے، لیکن بہر حال کمیشن کے جواب میں یہ کہیں دکھائی نہیں پڑا کہ مختلف سیاسی جماعتوں کے تکنیکی نمائندوں کو بھی بھلا موقع ملتا ہو کہ وہ ووٹنگ مشینوں کی چیکنگ کرسکیں۔ اس پس منظر میں اور ذہن میں یہ بھی رکھتے ہوئے کہ دہلی کے تین میونسپل کارپوریشنوں میں اگلے ماہ اپریل 2017 میں پنج سالہ الیکشن ہونے والے ہیں، زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا نے دہلی کے الیکشن کمشنر سے حق اطلاع قانون کے تحت یہ سوالات پوچھے ہیں: (i) 2017 میں ہونے والے الیکشن میں استعمال کے لیے کمیشن نے جن کمپنیوں سے ووٹنگ مشینیں حاصل کی ہیں، ان کے نام و پتے بتائے جائیں۔ (ii) ایسی مشینیں کتنی ہیں۔ (iii) کس تاریخ کو یہ مشینیں خرید کر دہلی لائی گئیں۔ (iv) یہ مشینیں کس طرح دہلی پہنچیں، سڑک پر ٹرک کے ذریعہ یا ریل گاڑی کے ڈبوں میں یا کسی اور طریقہ سے۔ (v) دہلی میں ان مشینوں کو کس جگہ سنبھال کے رکھا گیا ہے۔ (vi) ان مشینوں کی حفاظت کے لیے کیا انتظام کیا گیا ہے۔ (vii) چوبیس گھنٹے میں ان مشینوں کی حفاظت کے لیے کتنے سیکورٹی اہلکار تعینات رہتے ہیں۔ (viii) دہلی پہنچنے کے بعد کن تاریخوں کو دہلی الیکشن کمیشن کے ذریعہ ان مشینوں کی تکنیکی جانچ ہوئی، تاکہ ان کی صحیح کارکردگی کی تصدیق ہوسکے اور یہ جانچ کس نے کی۔ (ix) اگر یہ جانچ ہوئی ہے تو ان رپورٹوں کی نقلیں دی جائیں۔ (x) جن افراد نے یہ جانچ کی ان کی تکنیکی لیاقت کی تفصیل بتائی جائے۔ (xi) ان لوگوں نے یہ ٹریننگ کہاں سے اور کب حاصل کی۔ (xii) آنے والے ایم سی ڈی الیکشن کے امیدواروں کو کس تاریخ کو کمیشن مدعو کررہا ہے کہ ان کے تکنیکی نمائندے ان مشینوں کا معائنہ کرلیں۔ ابھی کمشنر کا جواب آنا باقی ہے۔ یہ امکان بعید از قیاس نہیں ہے کہ ووٹنگ مشینوں سے چھیڑ چھاڑ کی گئی ہو۔ صوبائی الیکشن کمشنر کے تحت ان مشینوں کی گارڈوں کے ذریعہ چوکسی سے تھوڑا بہت اطمینان ہوتا ہے۔ پھر بھی جیسا کہ انگریزی کی کہاوت ہے ’چائے کے پیالے اور پینے والے کے ہونٹوں کے درمیان ہاتھ پھسل بھی سکتا ہے۔‘ یہ بھی سن کے کانوں کو اچھا لگتا ہے کہ ووٹنگ مشینوں کی آپریٹنگ یونٹ میں سلیکان کے ذریعہ پختہ کندہ کاری (Permanent Silicon Engraving) کی جاتی ہے اور ایک دفعہ بن جانے کے بعد یہ پروگرام فیکٹری والوں کے ذریعہ بھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن شروع سے آخر تک فیکٹری والے خود بھی تو ووٹر ہیں اور یہ فیکٹریاں حکومت کے زیرنگیں بھی ہوتی ہیں۔ لہٰذا قدرتاً سوال اٹھتا ہے کہ الیکشن کمیشن کے پاس کیا اندرونی میکانزم موجود ہے یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ خریدنے سے قبل ہی ووٹنگ مشینوں میں خرد برد، خیانت یا کسی قسم کی دھاندلی نہیں کی گئی ہے اور یہ کہ ایسی چیکنگ کرنے کے لیے کمیشن کے اسٹاف کو مناسب ٹریننگ ملتی ہے۔ پولنگ بوتھ میں پریزائڈنگ افسر اگر ایک ووٹر کے باہر جانے کے بعد بٹن نہیں دباتا ہے تو بعد کے ناسمجھ ناخواندہ ووٹروں کو کیسے معلوم ہوگا کہ ان کا ووٹ نہیں پڑا۔ مشہور امریکی ٹی وی چینل سی این این کے ایک نیوز اینکر لاؤ ڈابس نے اپنے مضمون ’ووٹنگ مشینوں سے امریکی جمہوریت کو خطرہ‘ میں لکھا ہے کہ 2004 کے صدارتی انتخاب میں کولمبس اوہایو کے ایک مضافاتی علاقہ میں ایک مشین نے جارج بش کے حق میں 3900 فاضل ووٹ جوڑ دیے تھے جس کی پکڑ اس لیے ہوئی کہ ریکارڈ کے مطابق اس پولنگ بوتھ پر صرف 638 ووٹروں نے ہی ووٹنگ کی تھی۔ امریکی الیکشن سائنس انسٹی ٹیوٹ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کویا ہوگا کاؤنٹی میں ووٹنگ مشین کی گنتی کے چار ذرائع (انفرادی بیلٹ، کاغذی ٹریل خلاصہ، الیکشن محافظ خانہ اور یادداشت کارڈ) میں یکسانیت نہیں پائی گئی، چاروں ٹوٹل ایک دوسرے سے مختلف نکلے۔ رپورٹ میں یہ لکھا گیا کہ اس وقت رائج سسٹم کی بنیاد پر کویا ہوگا کاؤنٹی کی 13 لاکھ کی آبادی کی رائے دہندگی ووٹنگ مشین کے ذریعہ صحیح طرح سے ریکارڈ نہیں ہوئی۔ لاؤ ڈابس نے پوچھا کہ اس طرح کیا امریکی جمہوریت کو خطرہ میں نہیں ڈالا جارہا ہے۔ بی بی سی کے جولین سنڈل نے رپورٹ کیا ہے کہ مشیگن یونیورسٹی کے سائنسدانوں نے ہندوستان کی ووٹنگ مشینوں میں مداخلت کرنے کے لیے ایک تکنیک ایجاد کی ہے۔ نیوز ویک میگزین نے بھی یہی رپورٹ کیا ہے کہ الیکشن سے پہلے کبھی بھی مشین میں الیکٹرانک چپ لگائی جاسکتی ہے، جس سے مشین کے اندر کا پروگرام بدل جاتا ہے۔ اس طرح الیکشن کے دن مشین کام کرنا بند کرسکتی ہے یا غلط امیدوار کو غلط ووٹ جاسکتے ہیں۔ ہمارے عوامی نمائندگی قانون (Representation of People Act) کے سیکشن 61A کے تحت ضروری کارروائی کرنے کی فوری ضرورت ہے۔

□❖□

مشہور امریکی ٹی وی چینل سی این این کے ایک نیوز اینکر لائو ڈابس نے اپنے مضمون ’ووٹنگ مشینوں سے امریکی جمہوریت کو خطرہ‘ میں لکھا ہے کہ 2004 کے صدارتی انتخاب میں کولمبس اوہایو کے ایک مضافاتی علاقہ میں ایک مشین نے جارج بش کے حق میں 3900 فاضل ووٹ جوڑ دیے تھے جس کی پکڑ اس لیے ہوئی کہ ریکارڈ کے مطابق اس پولنگ بوتھ پر صرف 638 ووٹروں نے ہی ووٹنگ کی تھی۔

آئینہ......ضمیر ہاشمی

جہالت میں ہماری قوم جو بھی کام کرتی ہے
اُسے دنیا شریعت مان کر کہرام کرتی ہے
بنا ڈالا ہے ہم نے کھیل شادی کو، طلاقوں کو
ہماری یہ حماقت دین کو بدنام کرتی ہے

Published in 06 Apr-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

روہنگیا مہاجر، اقوام متحدہ، حکومت ہند اور ملت اسلامیہ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

برما

کی موجودہ آبادی 5.6 کروڑ ہے؛ وہ 1948 میں برطانیہ کی فرمانروائی سے آزاد ہوا تھا اور 1989 میں فوجی حکومت نے اس کا نام بدل کے میانمار کر دیا تھا۔ اس کی سرحد ہندوستان، بنگلہ دیش، چین، تھائی لینڈ اور لاؤس سے ملنے کے علاوہ بنگال کی کھاڑی، بحر ہند اور خلیج تھائی لینڈ میں جڑتی ہے۔ وہاں 5 کروڑ سے زیادہ لوگ بدھ مذہب کے ماننے والے ہیں، 30 لاکھ عیسائی، 23 لاکھ مسلمان، 3 لاکھ ہندو اور باقی متعدد دیگر فرقوں کے ہیں۔ انگریزی راج کے دوران برما جنوب مشرقی ایشیا کا دوسرا سب سے زیادہ دولتمند ملک تھا، چاول درآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک تھا اور دنیا بھر میں ساگوان کی لکڑی (Teak) کی پیداوار %75 برما میں ہوتی تھی؛ وہاں زمین کے نیچے تیل، معدنی اشیا (Mineral resources) اور ہیرے جواہرات (یاقوت، نیلم، موتی، فیروزہ) موجود ہیں۔ یاقوت (Ruby) کی دنیا کی کل پیداوار کا %90 برما میں نکلتا رہا ہے۔ 1930 کے بعد بین الاقوامی سطح پر چاول کی قیمتیں بہت نیچے گر گئیں جس کی وجہ سے وہاں چاول کی پیداوار پر کافی منفی اثر ہوا جو پھر نہیں سنبھلا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے جاپان کے بغض میں، وہاں تیل کے بڑے کنوؤں اور ٹنگسٹن، ٹین، تانبے اور چاندی کی کانوں کو تباہ کر دیا۔ دونوں فریقوں کی طرف سے وہاں بمباری ہوئی۔ 1948 میں آزادی تو مل گئی لیکن اس کے بعد سے میانمار میں اقتصادی اور سیاسی ٹھہراؤ نہیں آ سکا۔ حتیٰ کہ عوام کے بنیادی حقوق کی پامالی وہاں کی سیاسی ثقافت میں شامل ہو چکی ہے۔ بدھ مذہب کے ماننے والوں اور خود حکومت نے خصوصاً مسلمانوں کو (اور عیسائیوں کو بھی) تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ اس کی تاریخی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے روہنگیا طبقہ کو اپنے ساتھ رکھا تھا اور ان کی مدد سے اس وقت کی جاپانی حمایت والی کٹھ پتلی برمائی حکومت سے لڑائی کی تھی۔ اس کے نتیجہ میں تمادو ملٹری تنظیم قائم ہوئی جو حال تک ملک پر حکومت کرتی رہی۔ تمام بڑے صنعتی کارپوریشنوں میں اسی ملٹری حصہ داری کی اکثریت ہے۔ انھوں نے 1982 میں شہریت کا نیا قانون بنا کے مسلمانوں کو شہریت کے آئینی حق سے ہی محروم کر دیا۔ یہ مسلمان روہنگیا نسل کے ہیں اور لسانی اعتبار سے بنگال کے آریائی (Indo-Aryans) لوگوں سے زیادہ یکسانیت و مشابہت رکھتے ہیں بمقابلہ چین و تبت (Sino-Tibetans) کے۔

روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ گزشتہ کئی برس میں اتنی ظلم و زیادتی ہوئی ہے کہ ان میں سے تقریباً آدھے لوگ ملک سے مجبوراً ہجرت کر کے چوری چھپے بھاگ گئے، بہت سے تو غرقاب ہو گئے اور باقی دنیا میں جگہ جگہ دھکے کھا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ نے ان روہنگیا لوگوں کو 'دنیا کے سب سے کم چاہے جانے والے لوگ' اور 'دنیا کی سب سے زیادہ ستائی جانے والی اقلیت' کے اوصاف سے تعبیر کیا ہے۔ ان لوگوں کو ملک میں بغیر سرکاری اجازت کے سفر کرنا منع ہے، وہ زمین جائداد نہیں خرید سکتے، انھیں دو سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی ممانعت ہے، وہ فوج میں شامل نہیں ہو سکتے، حلال گوشت کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ میانمار حکومت نے انھیں 1982 سے 'بے وطن بنگالی مسلمان' کے زمرہ میں ڈال رکھا ہے جبکہ وہ لوگ وہاں صدیوں سے سکونت پذیر ہیں۔ 2012 میں میانمار میں ہزاروں مسلمان جاں بحق ہوئے، ہزاروں لاپتہ ہو گئے اور تقریباً 90,000 روہنگیا مسلمان پناہ گزین بن گئے تھے اور لاتعداد مکان زمین دوز کر دئے گئے تھے۔ پھر 2013 سے مسلمانوں کے خلاف تشدد میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب امریکہ اور یوروپین یونین نے میانمار میں اپنے قوت نافذہ والے اقتصادی فیصلے (Economic sanctions) واپس لے لئے۔ ایمرجنسی و کرفیو کے دوران مسلمانوں کے ساتھ مزید زیادتی ہوتی ہے اور بدھ مذہب کے راہب صاحبان پر الزام ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے بین الاقوامی انسانی امداد نہیں پہنچنے دیتے ہیں۔

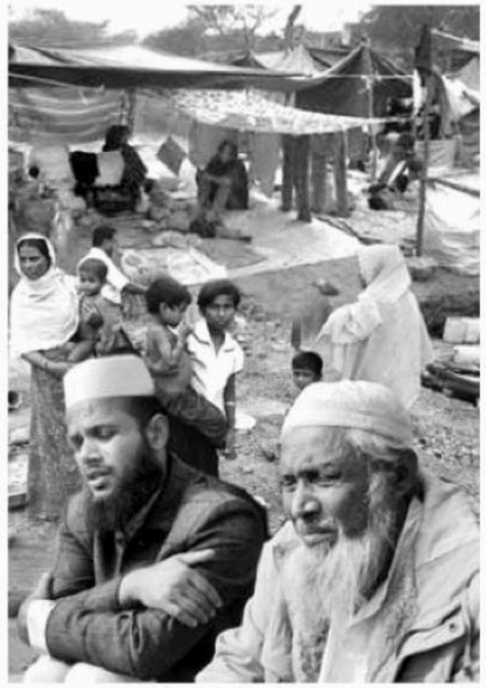

دو لاکھ سے زائد روہنگیا بنگلہ دیش میں، اتنے ہی پاکستان میں (جہاں ان میں سے بہتوں کو شہریت بھی ملی ہے) اور 50,000 سے زیادہ امریکہ میں پناہ گزیں ہیں۔ برمائی پناہ گزینوں کی بڑی تعداد ہمارے ملک ہندوستان میں بھی ہے۔ دہلی کے مدن پور خادر علاقہ میں زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا نے اپنی 1100 مربع گز زمین کے پلاٹ کو روہنگیا مسلمانوں کے لئے دارالہجرت کے نام سے وقف کر رکھا ہے۔ وہاں فی الحال 200 سے زیادہ روہنگیا مسلمان رہتے ہیں۔ چند برس قبل اس کا ذکر وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں بھی کیا تھا۔ ہندوستان کی عیسائی فلاحی تنظیمیں میانمار سے ہندوستان آئے ہوئے عیسائی پناہ گزینوں کی پوری امداد کر رہی ہیں، لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس کام میں کمی پائی جاتی ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی سورہ 9-8 میں خصوصی ذکر ہے کہ مسلمانوں پر اُن حاجت مند مہاجروں کا حق ہے جو جبراً و ظلماً اپنے گھروں سے نکال دئے گئے اور اپنی جائدادوں سے بے دخل کر دئے گئے ہیں؛ جو اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہیں، مشرکوں نے انھیں اتنا تنگ کیا کہ وہ ہجرت کر کے مہاجر کی حیثیت سے مسلمانوں کے پاس آئے ہوں۔ اس کی تفسیر میں مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ دارالہجرت اصلاً تو مدینہ منورہ ہی تھا لیکن باقی ہر دوسرا مقام بھی دارالہجرت ہو سکتا ہے جہاں توحید پرستی کے لئے پناہ و فراغت مل سکے۔ مہاجرین سے محبت میں اعلیٰ درجہ کی فضیلت ہے اور اُن سے بیزاری نقص ایمان کے مترادف ہے۔ ہمیں حکومت ہند سے زوردار اپیل کرنی چاہئے کہ جب انسانی مفاد اور قومی مفاد باہمی موافقت نہ رکھتے ہوں تو وہ انسانی مفاد کو برتری دے۔ لہٰذا وہ ملک میں آئے ہوئے روہنگیا لوگوں کو طویل مدتی ویزا گرانٹ کر دے۔ ہندوستان میں اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے رفیوجیز سے اس سلسلہ میں میری گفتگو ہوئی ہے اور وہ کوشاں ہیں کہ ہندوستان میں آئے ہوئے تمام روہنگیا لوگوں کو اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت پناہ گزین کا درجہ مل جائے۔

نومبر 2013 میں اقوام متحدہ کی حقوق انسانی کمیٹی نے قرارداد پاس کر کے میانمار حکومت سے کہا کہ روہنگیا مسلمانوں کو میانمار کی شہریت دی جائے اور وہاں کے بدھ مذہب کے نمائندوں سے اپیل کی کہ مسلمانوں کے خلاف تعصب و تشدد بند کیا جائے۔ لیکن میانمار حکومت نے اس قرارداد کو خارج کر دیا بلکہ اس کے جواب میں فوری طور پر ایک اور مسجد جلا دی گئی اور روہنگیا لوگوں کی مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا؛ ان پر میانمار میں ظلم و بربریت جاری ہے، لیکن ہم مسلمان اپنا دینی اور ملی فریضہ بھولے ہوئے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ حکومت ہند پر زور دیں کہ میانمار کی حکومت کی توجہ اس سمت دلوائے؛ وہاں کے سفیر برائے ہند کو وزارت خارجہ میں طلب کیا جائے؛ میانمار میں ہندوستانی سفارت خانہ میں سفارتکاروں کی تعداد کم کر دی جائے۔ میانمار کے ساتھ دو طرفہ تجارت میں ہندوستان کی طرف سے کمی کر دی جائے۔ سہ طرفہ ہائی وے پروجیکٹ کو زیر التوا کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ حکومت پر یہ بھی زور دیا جائے کہ وہ ASEAN، SAARC اور UNO میں میانمار کے خلاف غیر انسانی برتاؤ سے متعلق فرد جرم تیار کر کے قرارداد پیش کرے۔ BIMSTEC مذاکرات میں بھی برما کے مسلمانوں کی مظلومیت کا کوئی ذکر نہیں ہوا، پھر بھی ہم ہندوستانی مسلمان تماشبین بنے رہے۔ مسلم ممالک بھی برما کے مسلمانوں کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں۔ ہمیں علامہ کا دینی سبق یاد رکھنا ہوگا:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

ہم مسلمان اپنا دینی اور ملی فریضہ بھولے ہوئے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ حکومت ہند پر زور دیں کہ میانمار کی حکومت کی توجہ اس سمت دلوائے، وہاں کے سفیر برائے ہند کو وزارت خارجہ میں طلب کیا جائے۔ میانمار میں ہندوستانی سفارت خانہ میں سفارتکاروں کی تعداد کم کر دی جائے۔

آئینہ......ضمیر ہاشمی

گائے کی رکشا میں گر انساں کی لے لیں جان بھی
آستھا والوں کے ہاتھوں یہ بلی کیا چیز ہے
گئوکشی کے شک میں بستی پھونک سکتے ہیں یہ لوگ
گائے تو ماتا شری ہے، آدمی کیا چیز ہے

Published in 13 Apr-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

یوپی کی نگر پنچایتوں، نگر پالیکا پریشدوں اور نگر نگموں میں حد بندی

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

یوپی نگر پالیکا ایکٹ 1916 کے سیکشن 11(a) اور 2(6) اور یوپی نگر نگم ایکٹ 1959 کے سیکشن 32 و 53(a) کے مطابق نگر پنچایتوں، نگر پالیکا پریشدوں اور نگر نگموں (جنھیں مجموعی طور پر ہندی میں نکائے کہا جاتا ہے) کی حد بندی ایسی آخری قومی مردم شماری کے مطابق کیے جانے کا حکم ہے جس کے اعداد و شمار کی اشاعت ہو چکی ہو۔ 2011 کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی اشاعت ہو چکی ہے، اس لیے یوپی میں نگر پنچایتوں، نگر پالیکا پریشدوں اور نگر نگموں میں الیکشن کے لیے وارڈوں کی حد بندی کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس کے لیے یوپی کے چیف سکریٹری نے اپنے 4 اپریل 2017 کے خط کے ذریعہ صوبہ کے تمام کلکٹروں کو ہدایت دی ہے کہ 2011 کی مردم شماری کے مطابق جہاں آبادی 10,000 یا اس سے کم ہے، وہاں پنچایت / پریشد / نگم میں دس ممبر ہوں گے، جہاں آبادی 10,001 سے 12,500 کے درمیان ہے، وہاں 11 ممبر، 12,501-15,000 آبادی میں 12 ممبر، 15,001-17,500 میں 13 ممبر اور 17,501-20,000 آبادی میں 14 ممبر ہوں گے۔ 20,000 سے زیادہ ہر 5,000 کی اضافی آبادی پر ایک ممبر بڑھے گا اور یہ سلسلہ 40,000 کی آبادی تک جائے گا۔ جہاں آبادی 40,000 سے زیادہ ہے، وہاں ہر 10,000 تک کی اضافی آبادی پر ایک ممبر بڑھے گا اور یہ سلسلہ 2,90,000 کی آبادی تک جائے گا۔ 2,90,001 سے 2,99,999 میں ایک ممبر بڑھے گا۔ 300,000-3,50,000 آبادی پر کل 45 ممبر ہوں گے، 3,50,000-4,00,000 آبادی پر 50 ممبر ہوں گے، 4,00,000-4,60,000 پر 55 ممبر، 4,60,001-6,00,000 پر 60 ممبر، 6,00,001-9,00,000 پر 70 ممبر، 9,00,001-12,00,000 تک 80 ممبر، 12,00,001-15,00,000 پر 90 ممبر، 15,00,001-18,00,000 پر 100 ممبر اور 18,00,001 یا اس سے زیادہ آبادی پر 110 ممبر ہوں گے۔ یوپی نگر پالیکا ایکٹ 1916 و یوپی نگر نگم ایکٹ 1959 کے تحت نگر پنچایتوں کے وارڈوں کی تعداد کم سے کم 10 اور زیادہ سے زیادہ 24 ہوگی اور نگر پالیکا پریشدوں میں ممبروں کی تعداد کم سے کم 25 اور زیادہ سے زیادہ 55 ہوگی۔ نگر نگموں میں ممبروں کی تعداد کم سے کم 60 اور زیادہ سے زیادہ 110 ہوگی۔ ایسے نکایوں میں جہاں مردم شماری 2011 کے اعداد و شمار کے مطابق وارڈوں کی تعداد موجودہ تعداد سے بھی کم ہو رہی ہے، وہاں وارڈوں کی تعداد میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی اور اگر کسی نکائے میں وارڈوں کی تعداد میں صرف ایک یا دو کا اضافہ ہو رہا ہو تو وارڈوں کی تعداد میں وہ اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

ہر نکائے میں وارڈوں کو اس طور پر تقسیم کیا جائے گا کہ ہر وارڈ میں آبادی اتنی ہی ہو جتنی پورے نکائے کی آبادی کو وارڈوں کی تعداد سے تقسیم کیے جانے پر اوسط تعداد ہو۔ ناقابل تردید حالات کے باوجود کسی وارڈ میں یہ تعداد اس اوسط سے 15 فیصد سے زیادہ مختلف نہیں ہو سکتی۔ چیف سکریٹری کی ہدایت کے مطابق وارڈوں کی حدود کی وضاحت صرف الفاظ میں نہیں، بلکہ نقشہ پر سیاہی سے نشاندہی کے ذریعہ بھی کرنی ہوگی۔ حتی الامکان پکی سڑک، ریلوے لائن، محلّہ کے نام، ندی، نالے کی بنیاد پر وارڈوں کی جغرافیائی سرحد کی تصدیق ضلع مجسٹریٹ کے دستخط سے کی جانی چاہیے۔ ایک خاندان اور ایک محلّہ کے افراد کو ایک وارڈ میں ہی رکھا جائے گا اور اگر وارڈ میں ایک سے زیادہ محلے ہوں تو انھیں بھی ساتھ رکھا جائے گا۔ نئی حد بندی کی وجہ سے اگر ووٹروں کو ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ میں منتقل کرنا پڑے تو پورے پولنگ بوتھ کو ہی منتقل کیا جائے گا کیونکہ ایسا کرنے سے باز تخلیق (Realignment) میں آسانی ہوگی۔ اس کے علاوہ یوپی نگر نگم / نگر پالیکا پریشد / نگر پالیکا وارڈوں کی نمبرنگ و ریزرویشن ریگولیشن 1994 کے رول 3 کے مطابق حد بندی کے بعد اس وارڈ کو نمبر ایک کہا جائے گا، جہاں شیڈولڈ کاسٹ کے لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو اور اس کے مقابلہ میں جس وارڈ میں شیڈولڈ کاسٹ کی تعداد اس سے کچھ ہی کم ہو، اسے وارڈ نمبر 2 کہا جائے گا اور باقی تمام وارڈوں کو بھی اسی طور پر نمبر دیے جائیں گے۔

یوپی میں نگر پنچایتوں، نگر پالیکا پریشدوں اور نگر نگموں کے آخری انتخابات 2012 میں ہوئے تھے، اس وقت صوبہ میں کل 634 نکائے تھے جس میں سے 14 نگر نگم، 195 نگر پالیکا پریشد، 423 نگر پنچایتیں ہیں اور 2 میں الیکشن نہیں ہوا۔ لیکن اب 2017 میں کل تعداد بڑھ کے 654 ہو گئی ہے، جن نئی نگر پنچایتوں کا اضافہ ہوا ہے وہ ہیں ضلع گونڈہ میں پارسپور، بارہ بنکی میں بیلہرا، فیروز آباد میں ایکا، بلیا میں بیریا، پرتاپ گڑھ میں لال گنج، مئو میں چریا کوٹ، مدھوون اور ولید پور بستی میں ردھوولی اور بنکٹی، جون پور میں بدلا پور، اعظم گڑھ میں ماہول اور میرٹھ میں ہرّا اور کھِدائی۔ واضح رہے کہ یکم اکتوبر 2009 کو سہارنپور نگر پالیکا کو نگر نگم میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن وہاں وارڈوں کی حد بندی اور ان کے ریزرویشن کی کارروائی ابھی تک نہیں ہوئی ہے، لہٰذا 2009 سے اب تک وہاں نگر نگم کے الیکشن ہی نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ترمیم شدہ پارلیمانی حد بندی ایکٹ 2002 کے سیکشن 9(1)(c) کے مطابق وہی وارڈ شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو ہوں گے جن میں شیڈولڈ کاسٹ کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ایسا کرنے سے قبل، جیسا اوپر لکھا ہے، ضلع مجسٹریٹ کو تمام نگر پالیکاؤں، پریشدوں اور نگموں میں ہر وارڈ میں شیڈولڈ کاسٹ کی تعداد اور فیصد تحریر کرتے ہوئے ایک چارٹ تیار کرنا ہوگا، جس میں سب سے زیادہ شیڈولڈ کاسٹ فیصد والا وارڈ سب سے اوپر رکھا جائے گا، اس کے نیچے اس سے کم والا اور سب سے نیچے سب سے کم شیڈیولڈ کاسٹ فیصد والا وارڈ لکھا جائے گا۔ یہ چارٹ عوام کو دکھایا جانا چاہیے، جس سے وہ مطمئن ہو سکیں کہ سب سے زیادہ شیڈیولڈ کاسٹ فیصد والے وارڈ ہی ریزرو کیے گئے ہیں، ورنہ عوام اس پر اعتراض داخل کر سکتے ہیں۔

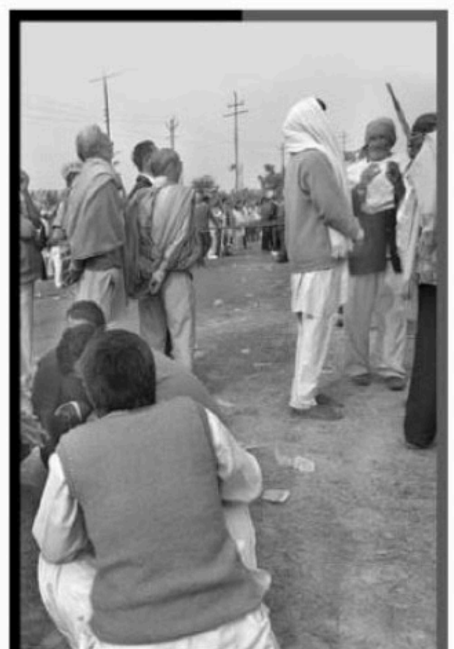

تمام یوپی کے ہر ضلع میں ہر نکائے میں عوام کو فوری طور پر بہت زیادہ چوکنا اور متحرک ہو جانا ہے۔ ضلع مجسٹریٹ سے معلومات حاصل کیجیے کہ وہ ضلع میں نگر پنچایتوں، نگر پالیکا پریشدوں اور نگر نگموں میں وارڈوں کی حد بندی کس طرح کر رہے ہیں، کہیں کسی ضابطہ کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی ہے، کہیں آپ کی حق تلفی تو نہیں ہو رہی ہے اور پھر جب الیکشن کا وقت آئے تو خدا کے واسطے ملت کی طرف سے 100 فیصد ووٹ ڈلوایئے اور غیر متحدہ کے اپنے پیر پر دوبارہ کلہاڑی مت ماریے۔ یاد رکھئے کہ فی الوقت 195 نگر پالیکا پریشدوں میں سے 59 میں مسلم چیئرمین ہیں اور 423 نگر پنچایتوں میں سے 108 میں مسلم چیئرمین ہیں، لیکن موجودہ 14 نگر نگموں میں سے ایک بھی چیئرمین مسلم نہیں ہے۔ آپ کو دھیان رکھنا ہے کہ رواں حد بندی کی وجہ سے آپ کے نمائندوں کی تعداد کم نہ ہو جائے اور یہ بھی یقینی بنانا ہے کہ اگر کہیں پہلے حق تلفی ہوئی ہے تو وہ اب تازہ حد بندی میں ٹھیک ہو جائے۔ اب بہت ہو گیا، اپنا حق جمانے پر شرمانا چھوڑ دیجیے۔ حکام کے رحم و کرم پر رہنا چھوڑ دیجیے، خود آگے بڑھ کے اپنی نگر پنچایت، نگر پالیکا پریشد یا اپنے نگر نگم کی آبادی مردم شماری 2011 کے مطابق معلوم کیجیے، ممبروں کی تعداد اس مضمون کے مطابق یقینی بنایئے، وارڈوں کی حد بندی معقول کروایئے اور سب سے زیادہ شیڈولڈ کاسٹ فیصد کے علاوہ کسی وارڈ کو ریزرو مت ہونے دیجیے، جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔

□❖□

تمام یو پی کے هر ضلع میں هر نکائے میں عوام کو فوری طور پر بهت زیاده چوکنا اور متحرک هو جانا هے۔ ضلع مجسٹریٹ سے معلومات حاصل کیجیے که وه ضلع میں نگر پنچایتوں، نگر پالیکا پریشدوں اور نگر نگموں میں وارڈوں کی حدبندی کس طرح کر رهے هیں ، کهیں کسی ضابطه کی خلاف ورزی تو نهیں هو رهی هے، کهیں آپ کی حق تلفی تو نهیں هو رهی هے۔

آئینہ......ضمیر ہاشمی

ظلم کے ساتھ نظر آتا ہے کیوں سارا ہجوم
سنگ سب نے تو نہ ہاتھوں میں اٹھائے ہوتے
کوئی تو آتا ہماری بھی حفاظت کے لیے
آدمی ہونے سے بہتر تھا کہ گائے ہوتے

Published in 20 Apr-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

یہودی، عیسائی و مسلم داڑھی سکھ داڑھی سے کمتر کیوں؟

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

سپریم کورٹ کے معزز چیف جسٹس نے گزشتہ ہفتہ مہاراشٹر کے معطل مسلم پولیس کانسٹیبل ظہیرالدین شمس الدین بیداڑے کو پیشکش کی کہ اگر وہ صرف تہواروں میں داڑھی رکھنے کے لیے راضی ہو جائیں تو وہ انھیں ان کی معطلی سے آزاد کروا سکتے ہیں۔اس مرد مومن کی قوت ایمانی کی دلیل ہے کہ اس نے سپریم کورٹ کی اس پیش کش کو یہ کہتے ہوئے مسترد کردیا کہ اسلام میں داڑھی عارضی نہیں ہوتی ہے، جس پر عدالت نے کہا کہ ان کو شمس الدین کی حالت پر افسوس ہے لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتی ہے۔اس کے برخلاف ہندوستان میں سکھ سرکاری ملازم کو کھلی چھوٹ ہے کہ وہ اطمینان سے پورے سال، عمر بھر داڑھی رکھے پھر بھی اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ آیئے غور کریں کہ ہمارے ملک کے اس متعصّبانہ رویہ کی دستور ہند اور متعدد مذہبی صحیفوں کی روشنی میں کیا حیثیت ہے۔دستور ہند کا آرٹیکل 15 کہتا ہے کہ سرکار کی طرف سے مذہب کی بنیاد پر کسی شہری پر کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی اور تعصب نہیں کیا جائے گا۔آرٹیکل 16 کے مطابق حکومت کے تحت کسی ملازمت یا عہدے کے معاملہ میں سب کو برابر کا موقع دیا جائے گا اور مذہب کی بنیاد پر کوئی شہری کسی سرکاری ملازمت یا عہدے کے لیے نااہل نہیں قرار دیا جائے گا۔آرٹیکل 25 کہتا ہے کہ تمام لوگوں کو ضمیر کی آزادی ہوگی اور اپنے اپنے مذہب کو ماننے، اس پر چلنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی آزادی ہوگی۔آرٹیکل 29 کے مطابق ملک میں کہیں بھی رہنے والے شہریوں کے کسی بھی گروہ کو جن کی اپنی تہذیب ہو اسے حق ہوگا کہ وہ اپنی اس تہذیب کی حفاظت کرے۔آرٹیکل 51A(e&f) ہر شہری کا فریضہ متعین کرتا ہے کہ وہ بغیر مذہبی تفریق کے ملک کے تمام شہریوں کے مابین ہم آہنگی اور بھائی چارے کو فروغ دے اور مختلف اجزا سے بنی ہوئی ہماری مخلوط تہذیب کی شاندار وراثت کی قدر دانی اور اس کا تحفظ کرے۔

الہامی کتاب طومارِ بحرالمیت (Dead Sea Scroll) میں تحریر ہے کہ جب پروردگار عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشیمانی کو قبول کرلیا تو انھوں نے سجدے میں گر کر دعا کی کہ انھیں جمال عطا کیا جائے، اس کے فوراً بعد ان کے چہرے پر داڑھی نکل آئی جس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے خوش خبری دی کہ یہ داڑھی اب قیامت تک آپ کی اولاد نرینہ کے چہرے پر رہے گی اور اس طور پر داڑھی مردانہ وجاہت کی نشانی بن گئی۔لہٰذا بائبل میں داڑھی مونڈنے کو رنج و گریہ اور ذلت و رسوائی کا نشان مانا جاتا ہے (Job1.20&Ezek5.1ff) اور اس زمانہ میں کسی کی توہین کرنے کے لیے اس کی آدھی داڑھی منڈوا دی جاتی تھی (2ndSamuel10.4)۔ یہودیوں کی کتاب تلمود میں داڑھی کو مردانہ چہرے کی شان مانا گیا ہے (BM84a)، سنہریب کو سزا دینے کے لیے اس کی داڑھی منڈوا دی گئی تھی (Sanh95b-96a)، یہودی باجماعت عبادت کی امامت کے لیے داڑھی ضروری رکھی گئی (BahOH53)، جب یہودی تصوف (Hasidism) نے زور پکڑا تو بغیر داڑھی والے کو یہودیت سے خارج مانا جانے لگا اور Leviticus19.27 میں تو داڑھی نہ منڈوانے کا حکم موجود ہے۔عیسائیوں کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا سے پردہ پوشی سے قبل اپنے جن 12 ساتھیوں کے ساتھ آخری دفعہ رات کا کھانا کھایا تھا جسے خیر و برکت کا کھانا (Last Supper) مانا جاتا ہے، اس میں ایک خاتون اور 10 داڑھی والے مرد تھے۔موجودہ زمانہ میں بلجیم کے وزیراعظم چارلس مائیکل، اسپین کے وزیراعظم میریانو راجوائے، صدر ترکی طیب اردگان، وزیراعظم ہند نریندر مودی، صدر ایران حسن روحانی، صدر مصر محمد مرسی، صدر برازیل لویزاناسیو سلوا، سلطان برونئی حسن البولقیہ، سعودی شاہ سلمان وغیرہ بہتوں کے داڑھی ہے۔

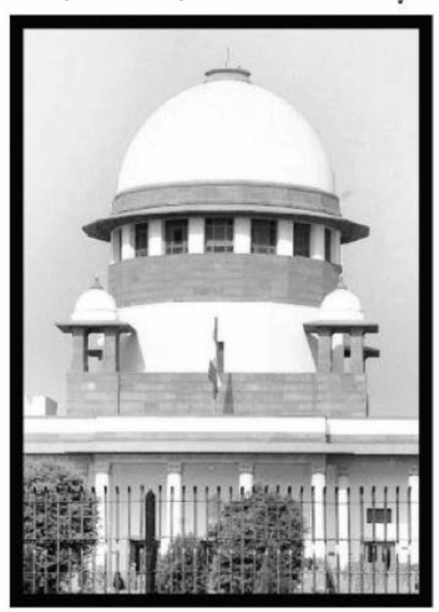

قرآن کریم میں داڑھی کا ذکر سورہ طٰہٰ کی آیت 94 میں آیا ہے، جب حضرت ہارون نے برادر بزرگ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ میری داڑھی اور سر کے بال پکڑ کے مت کھینچیے، دراصل وہ حضرت موسیٰ کے غصہ کا اظہار تھا کہ بچھڑے کو معبود کیوں بنایا گیا۔صحیح بخاری کے مطابق حضور اقدسؐ نے حکم دیا (7.780) کہ داڑھی کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو گھٹاؤ۔سنن ابو داؤد (145) کے مطابق وضو کے دوران حضور اکرمؐ داڑھی کو بخوبی دھوتے تھے۔ یہ کہہ کر کہ ایسا کرنے کے لیے اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ادھر قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ حضور اکرمؐ کی مکمل اطاعت کی جائے (4.59,8.20,8.24,33.21)۔کتاب الآثار میں امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہاتھ کی مٹھی میں جتنی داڑھی آجائے اس سے کم داڑھی رکھنا حرام ہے اور امام شافعی نے اپنی کتاب الامّ میں لکھا ہے کہ داڑھی مونڈنا حرام ہے۔یہی بات سنن امام مالک اور حنبلی کتابوں شرح المنتہا اور شرح منظومۃ الآداب میں درج ہے۔امام غزالیؒ نے کتاب اربعین الدین (قاہرہ 1344 صفحہ 89) میں لکھا ہے کہ بہترین زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ حضور اکرمؐ کی سنت پر عمل کیا جائے۔معتبر شیعہ قانون داں حضرات شیخ البہائی اور الدمد نے بھی اپنی کتابوں الاعتقادات اور رسالہ الشرع المقدس میں بھی یہی حکم صادر کیا ہے۔

دوسری طرف اصطباغ شدہ (Baptised) یا امرتسری سکھ کے لیے ضروری ہے کہ وہ سر اور داڑھی کے بال نہ کاٹے۔یہ حکم دسویں گرو گووند سنگھ جی نے بیساکھی 1699 میں جاری کیا تھا، ساتھ میں ایک کنگھا بھی رکھا جاتا ہے تاکہ خدا کے دیے ہوئے بالوں کا خوش اسلوبی سے رکھ رکھاؤ بھی کیا جائے۔شری گرو گرنتھ صاحب میں متعدد شبد ہیں جن سے سر اور داڑھی کے بالوں کے رکھنے کا اشارہ ملتا ہے۔صفحہ 1335 پر بندہ کہتا ہے کہ میں گرو کے پیر اپنے بالوں سے صاف کرتا ہوں اور صفحہ 941 کے مطابق گرمکھ یعنی ایماندار دیندار انسان اپنے ہر بال کے ذریعہ عبادت کرتا ہے اور وہ خدا کی ہستی میں شامل ہو جاتا ہے۔بھائی گرو داس جی نے لکھا ہے (وار 28 پوڑی 10) کہ گرو کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنا ہی اصل سکھ زندگانی ہے۔ان سب ہدایات کے باوجود بہتیرے عیسائی، یہودی، مسلمان اور سکھ لوگ ہیں جو داڑھی نہیں رکھتے ہیں، لیکن ان کے ایسا کرنے یا نہ کرنے سے یہ طے نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا مذہب داڑھی کے بارے میں کیا حکم دیتا ہے۔

اس پس منظر میں سپریم کورٹ کے معزز جج صاحبان کو یہودی، عیسائی اور مسلم عوام اور ان کے بہی خواہوں کو یہ بتانا چاہیے کہ سکھ مذہب کے وہ کون سے احکامات ہیں جو سکھوں کی داڑھی کو وہ غیر معمولی درجہ دیتے ہیں جو عدالتی نظر میں یہودی، عیسائی اور مسلم داڑھی کو حاصل نہیں ہے۔بہ الفاظ دیگر یہودی، عیسائی اور مسلم داڑھی کو سپریم کورٹ کی نظروں میں سکھ داڑھی سے کمتر کیوں رکھا گیا ہے۔کیا یہ دستور ہند کے آرٹیکل 15 سے روگردانی نہیں ہے، جس میں مذہب کی بنیاد پر تعصب کی ممانعت ہے۔کیا اس کو آرٹیکل 16 کی خلاف ورزی کہا جاسکتا ہے، جس میں حکومت کے تحت ملازمت کے معاملات میں سارے شہریوں کے مابین مساوات کی تاکید کی گئی ہے۔کیا اس طرح ضمیر کی آزادی اور اپنے اپنے مذہب کو ماننے اور اس پر چلنے کے لیے سب کو برابر کا حق دیا جاسکتا ہے۔آئندہ شقوں میں بھی یہی سوالات قائم ہیں۔

□❖□

آرٹیکل 16 کے مطابق حکومت کے تحت کسی ملازمت یا عہدے کے معاملہ میں سب کو برابر کا موقع دیا جائے گا اور مذہب کی بنیاد پر کوئی شہری کسی سرکاری ملازمت یا عہدے کے لیے نااہل نہیں قرار دیا جائے گا۔ آرٹیکل 25 کہتا ہے کہ تمام لوگوں کو ضمیر کی آزادی ہوگی اور اپنے اپنے مذہب کو ماننے، اس پر چلنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی آزادی ہو گی۔

آئینہ......ضمیر ہاشمی

منہدم اللہ کا گھر جن کی سازش سے ہوا
اس طرح اُن کو کیا ہے دستِ قدرت نے ذلیل
اُن کے اپنوں کی حکومت، اُن کے اپنوں کے مفاد
کورٹ میں اب دیں گے خود اُن کے گناہوں کی دلیل

Published in 27 Apr-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

حج کیلئے پانی کا جہاز دوبارہ شروع کرنا غلط

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

تقریباً ایک تہائی صدی کے طویل وقفہ کے بعد سفر حج کے لیے پانی کے جہاز کی پھر سے شروعات کرنے کا مرکزی وزارت برائے اقلیتی امور کا رجعت پسندانہ فیصلہ غالباً اس فروگزاشت پر مبنی ہے کہ اس عنوان پر وزارت خارجہ وجدہ میں ہندوستانی قونصل خانہ کی اُس وقت کی فائلیں نہیں پڑھی گئیں، جس طرح ترسیلی سلسلہ میں تبدیلی ہوتی رہی ہے ڈاک خانہ کا لفافہ، پھر فیکس، پھر ای-میل، پھر وہاٹس ایپ وغیرہ اسی طرح سے مواصلات کے طریقوں میں بھی سدھار و بہتری ہونا فطری ولازمی ہے یعنی گھوڑا، تانگہ، بس، ریل گاڑی، ہوائی جہاز۔ لہٰذا یقیناً اکیسویں صدی میں 5,748 کلو میٹر کا سفر بجائے ہوائی جہاز کے پانی کے جہاز سے کرنے پر سوالات اٹھنا تو ضروری ہیں۔ تین دہائی قبل 1989-90 میں حکومت ہند کے ذریعہ حج کے لیے پانی کا جہاز بند کردیا گیا تھا جس کی بنیاد تھی سعودی عرب میں ہندوستانی سفارت خانہ کی تحقیق شدہ، جامع و مدلل سفارش۔ پانی کے جہاز کے ختم کرنے کے متبادل کے طور پر اسی وقت سے ہندوستانی سفارت خانہ، مرکزی وزارت برائے شہری ہوابازی اور سعودی حکومت کے مابین سہ شاخی سلسلہ گفت شنید کے بعد ہندوستان میں تقریباً ایک درجن اضافی صوبوں وضلعوں سے جدہ کے لیے براہ راست پروازیں شروع کردی گئی تھیں اور تب سے اب تک جگہ جگہ ائیرپورٹوں پر حج ٹرمنلوں کا قیام بھی عمل میں آتا رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہونا ضروری ہے کہ کن وجوہات سے پانی کا جہاز بند کردیا گیا تھا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ بحری سفر غریب حاجیوں کے لیے سستا پڑتا ہے، لیکن ایسا کہنا کسی طرح سے بھی صحیح نہیں ہے۔ حج کرنے کے فریضہ کا بنیادی ذکر قرآن کریم کی سورہ آل عمران (3.97) میں آیا ہے۔ اس آیت کی روشنی میں مفسرین عالم متفق ہیں کہ حج ان افراد پر فرض ہے جن میں مالی فراوانی اور جسمانی صحت دونوں کی ذاتی استطاعت ہو۔ لہٰذا انفرادی غربت اور فریضہ حج ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اگر پھر بھی حج ادا کرنے کے لیے کوئی غریب شخص سفر حج کی ترکیبیں کھوجنے کی جستجو کرتا ہے جس کے لیے وہ اپنے ان مالی ذرائع کا ذرا بھی استعمال کرتا ہے جن پر روزمرہ کی ضروریات زندگی کے لیے اس کے اہل وعیال، اہل خاندان اور ہمسایہ کا حق ہے تو وہ حکم الٰہی کی نافرمانی کر رہا ہے اور بارگاہ ایزدی میں اس کے اس سفر کا مقصد ذاتی سیر وتفریح اور سیاحت (Tourism) مان سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہ مفروضہ کہ سمندر کے سفر کی وجہ سے حاجی کا خرچ کم ہوتا ہے، زمینی حقیقتوں اوراعداد و شمار سے ثابت نہیں ہوتا ہے۔ سمندر سے سفر حجاز کے لیے ہندوستان کی دور دراز جگہوں سے حاجی کو ممبئی سے روانگی سے کم از کم تین روز قبل وہاں پہنچنا ہی ہوتا ہے اور واپسی کے بعد دوبارہ اسے ممبئی میں تین روز کا قیام وطعام کرنا ضروری ہوتا ہے، ظاہر ہے 1,500 افراد کی دستاویزی باضابطگی کے لیے اتنا وقت تو چاہیے۔

ہندوستان میں ضرورت سے زیادہ اس لمبے سفر اور ممبئی میں ان چھ دنوں کے قیام پر سمندر کے حاجی کو وہ فاضل خرچ کرنا ہوتا ہے، جو اسے ہوائی سفر کے لیے نہیں کرنا ہوتا ہے۔ ممبئی سے جدہ کے بحری سفر میں دس روز لگتے ہیں اور وہاں سے خالی جہاز کی واپسی کے لیے دوبارہ دس روز چاہئیں۔ اس طرح 4,500 حاجیوں کو ممبئی پہنچانے کے لیے دو ماہ لگتے ہیں اور حج کے بعد ان کو ممبئی پہنچانے کے لیے پھر دو ماہ چاہئیں۔ اس کے برخلاف ہوائی سفر کے ذریعہ اس کے بیس گنا تعداد میں حاجیوں کو صرف ایک ماہ میں ہندوستان سے جدہ پہنچا دیا جاتا ہے اور ان کی واپسی میں بھی صرف ایک ہی ماہ لگتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہوائی سفر کے مقابلہ میں پانی کے جہاز سے سفر کرنے والے ہر حاجی کو سعودی عرب میں ایک ماہ فاضل قیام کرنا ہوتا ہے، جس کے دوران طعام و دیگر ضروریات پر اس کا فاضل خرچ ہوتا ہے۔ یہ جو فاضل رقم سمندری حاجی کو ممبئی کے دونوں طرف کے فاضل سفر، ممبئی میں فاضل قیام وطعام اور سعودی عرب میں ایک ماہ فاضل قیام کے دوران کرنی ہوتی ہے، وہ اُس رقم سے زیادہ ہوسکتی ہے جو ہوائی سفر کے مقابلہ میں پانی کے جہاز سے سفر کرنے کی وجہ سے اس کے پاس بچتی ہے۔ یہ بھی ان حاجیوں کے لیے ہے جو پانی کے جہاز کے نیچے کے حصہ میں سفر کرتے ہیں جہاں انھیں دس روز تک روشنی اور ہوا کی کمی میں رہنا ہوتا ہے اور اگر جہاز بہت پرانا ہے تو سفر کے آخر کے دنوں میں اس میں سمندر کا پانی بھی رس کر اندر آنے لگتا ہے جس کی وجہ سے مسافر بیمار بھی ہوجاتے ہیں۔ جہاز کے اوپر کے حصہ میں حالات قدرے بہتر ہوتے ہیں، لیکن وہاں سفر کرنے کے لیے زیادہ رقم دینی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہوائی سفر کے مقابل ٹکٹ میں بچت نا کے برابر رہ جاتی ہے۔

تین دہائی قبل تک ممبئی کی مرکزی حج کمیٹی میں قلیوں کا رواج تھا، وہ قلی لوگ حاجیوں کا سامان حج ہاؤس سے جہاز تک اور جدہ سے واپسی پر جہاز سے حج ہاؤس تک لے جاتے تھے، ان کا محنتانہ حج کمیٹی کے ذریعہ حاجی سے وصول کی جانے والی رقم میں شامل ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہوائی سفر کرنے والے حاجیوں کو یہ رقم بھی نہیں خرچ کرنی ہوتی تھی۔ لیکن اصل معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ بغیر حاجی کے علم میں لائے ہوئے قلی لوگ حاجی کے نام میں اپنے سامان (Cargo) کا ایک بڑا سا بکس جہاز پر سوار کردیتے تھے۔ ایسے بہت سے قلی لوگوں کے پاس سعودی عرب کا اقامہ ہوتا تھا، جس کا استعمال کر کے وہ پانی کے جہاز کے ممبئی سے روانہ ہونے کے نویں روز خود ہوائی جہاز سے جدہ پہنچ کر جدہ بندرگاہ کے پاس مقیم حاجیوں کے لیے مدینۃ الحجاج نامی اہتمامی مرکز میں سے اپنا سامان لے کر اسے مکہ مکرمہ کے بازار میں فروخت کر دیتے تھے۔ حاجی کی واپسی پر بھی وہی قلی سعودی عرب سے خریدے ہوئے سامان کا اپنا وہی بکس حاجی کے علم کے بغیر لیکن حاجی کے نام پر جہاز میں چڑھوا دیتے تھے اور ممبئی میں اسے اتار کر وہاں کے بازار میں فروخت کر دیتے تھے۔ اس وقت ان قلیوں نے باہمی امن کمیٹی نام کی ایک تنظیم بھی بنا رکھی تھی جس نے پانی کے جہاز کے بند ہونے کے خلاف مظاہرہ بھی کیا تھا۔ موجودہ مرکزی حکومت اور خصوصاً وزارت برائے اقلیتی امور کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے کو اور عوام کو مطمئن کریں کہ جن وجوہات کی بنا پر پانی کا جہاز 28 برس قبل بند کیا گیا تھا، کیا وہ وجوہات اب ختم ہوگئیں۔ کیا واقعی پانی کے جہاز سے سفر کرنے والے حاجی کے اخراجات میں بچت ہوگی۔ اس کا پورا حساب لگا کے ایک وہائٹ پیپر جاری کرنا ضروری ہے۔

دوسری طرف یہ کہنے سے پہلے کہ کیونکہ 'حج سبسڈی' ختم کی جانی ہے، اس لیے پانی کے سفر کا کم خرچ متبادل دے دیا جائے، یہ بھی جاننا چاہیے کہ حج سبسڈی کی حقیقت ہے کیا۔ حاجیوں کے ہوائی سفر کے لیے ہماری قومی ائیر کمپنی ائیر انڈیا کا خیال ہے کہ ایسا کرنے کا اسی کا منفرد حق ہے، بلاشرکت غیرے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اگر حاجی کو یکساں ریٹ پر یکساں سہولتیں مل رہی ہوں تو ضرور ائیر انڈیا کا پہلا حق ہے، لیکن اس دعوے کی صداقت طے کرنے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ ہندوستانی حاجیوں کے ہوائی سفر کے لیے عالمی سطح پر ٹنڈر مدعو کرے، پھر اگر ائیر انڈیا کا کرایہ سب سے کم ٹنڈر کرنے والی ائیر لائنس سے زیادہ نہیں ہے تو ائیر انڈیا کو ہی یہ کام دے دیا جائے، ورنہ سب سے کم رقم پر حاجی کو لانے لے جانے کے لیے دنیا کی جو بھی ائیر لائن بڑھ کے آگے آئے اسے یہ کام سونپ دیا جائے۔ اس کے بالمقابل ہو یہ رہا ہے کہ ائیر انڈیا بہت زیادہ مالی فائدہ لیتے ہوئے ٹکٹ کی قیمت مقرر کرتی ہے، مالی فائدہ کی وہ فاضل رقم حکومت ہند کے خزانہ میں چلی جاتی ہے اور اسی میں سے کچھ رقم کو سبسڈی کا نام دے کر حکومت کہتی ہے کہ وہ حاجی کے ساتھ احسان کر رہی ہے۔ اگر حاجیوں کی یہ حق تلفی بند کر دی جائے تو پانی کا جہاز دوبارہ شروع کرنے کا جواز اور بھی نہیں ہے۔

□❖□

ائیرانڈیا بہت زیادہ مالی فائدہ لیتے ہوئے ٹکٹ کی قیمت مقرر کرتی ہے ، مالی فائدہ کی وہ فاضل رقم حکومت ہند کے خزانہ میں چلی جاتی ہے اور اسی میں سے کچھ رقم کو سبسڈی کا نام دے کر حکومت کھتی ہے که وہ حاجی کے ساتھ احسان کر رہی ہے۔اگر حاجیوں کی یہ حق تلفی بند کر دی جائے تو پانی کا جہاز دوبارہ شروع کرنے کا جواز اور بھی نہیں ہے۔

آئینہ......ضمیر ہاشمی

راجدھانی میں رہا ڈینگو، چکن گنیا کا راج
گندگی اور مچھروں سے تنگ تھا پورا سماج
ایم سی ڈی کے الیکشن میں مگر ایسا لگا
چل گیا جمہوریت میں اندھ بھکتی کا رواج

Published in 04 May-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

موجودہ ملکی حالات اور ہماری ذمہ داریاں

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

آیئے ہم افراد ملت ملک کے موجودہ حالات کو بجائے پنگھٹ کی کٹھن ڈگر سمجھنے کے اس وقت کو اللہ کی رحمت مانیں اور حالات حاضرہ کا اس ہدایت قرآنی (94.5) کی روشنی میں تجزیہ کریں جس میں کہا گیا ہے کہ یقیناً ہر پریشانی میں راحت ہے۔ ملت کی تاریخ میں ہمیں ایسے حالات سے اللہ نے اس سے قبل بھی دو چار کیا ہے۔ اگر اغیار جمع ہو کر سمت مخالف میں بیداری تجسس اور منفی کارپردازیوں کی منصوبہ بندی اور اس پر ضرررساں عملیات کی سلسلہ جنبانی میں اپنے کو مصروف رکھے ہوئے ہیں اور پھر بھی ہم اندرون ملت باہمی تعاون سے گریز کرتے رہیں تو ہماری یہ سہل انگاری غیر فطری بھی ہے اور بدشگون بھی۔ لہٰذا ہمیں سوچ سمجھ کے اپنی حکمت عملی طے کرنی چاہیے جس سے ہم صرف موجودہ بحران سے نکل ہی نہ آئیں بلکہ آئندہ کی نسلوں کے لیے ملکی پگڈنڈی کو ہموار بھی کر دیں اور اگر اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے ملت کو اپنے طرز تفاعل و تعامل میں فی الوقت معمولی اشکال میں رد و بدل (Kaleidoscopic change) کرنی پڑے تو بھی مضائقہ نہیں ہے۔ ہمیں تین میعادوں کے منصوبے متعین کرنے ہوں گے: دو برس کے، بیس برس کے اور سو برس کے اور متفقہ راہ عمل ایسی بنانی ہوگی کہ ان تینوں منصوبوں پر ایک ساتھ کارروائی چلتی رہے۔ اس روشنی میں (i) علمائے کرام اور ملت کے جدید تعلیم یافتہ دردمند دانشوروں کو اپنے درمیان مضبوط باہمی رابطے و اعتماد سازی کو فروغ دینا ہوگا تاکہ دونوں طبقوں کی دانشمندی و بصیرت اور جذبہ فلاح ملی کو یکجا کر کے مجموعی طور پر ملت کے مستقبل کے لیے مستقل کارآمد کارروائی کی جاسکے۔ (ii) ہر صوبہ، ضلع، شہر، قصبہ، گاؤں و محلہ میں تمام مساجد کے امام و مؤذن صاحبان اور دیار مسجد کے اہم لوگ جو متولی، صدر، سکریٹری یا کمیٹی ممبر یا دیگر طریقہ سے ذمہ دار یا نمازی ہوں ایسے افراد کے نام، گھر کے پتے، ای-میل اور موبائل نمبر یکجا کر کے ان کی ایک ڈائریکٹری تیار کر کے اس کی نقلیں آپس میں تقسیم کرنی ہوں گی تاکہ اس دائرے کے لوگ متعدد انداز کے باہمی امداد و تعاون کے لیے پابہ رکاب رہ سکیں۔

(ii) ملک کی تمام مسجدوں کو ملت کی دینی و دنیاوی ضرورتوں کی تکمیل، معذوروں، ضعیفوں، مریضوں، ضرورت مندوں کے لیے اعانت، یتیموں کی خبر گیری اور ملت کی سماجی نگرانی کا مرکز بنایا جائے۔ ہر مسجد اپنے چوطرفہ 40-40 گھروں یعنی کل 160 مکانات کا مرکز، نگراں اور سرپرست بنادی جائے اور اس دائرے میں غیر مسلم اشخاص بھی امداد کے حق دار ہوں۔ (iii) جمعہ کا بیان ملت کی تربیت کے لیے ایک کارآمد ذریعہ نشر و اشاعت ہے اور تقریباً 80-90 فیصد مسلمان اس سے ہر ہفتے مستفیض ہوتے ہیں۔ لہٰذا جمعہ کے خطیب حضرات علما و دیگر دانشوروں کے تعاون سے خود کے اور ساتھیوں کے لیے خطبہ سے متعلق رہنما اصول مرتب کرلیں تاکہ جمعہ کے بیانوں کو زیادہ مفید و مؤثر بنایا جاسکے، اس طرح ان شاء اللہ بہت تھوڑے وقفہ میں ہی ملت کے اندر ضروری بیداری پیدا ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں خطبہ جمعہ کے موضوعات کے انتخاب میں مدد اور عصری تقاضوں پر بولنے کے لیے معلومات کی فراہمی ویب سائٹ، انٹرنیٹ، ای-میل و وہاٹس ایپ وغیرہ جیسے جدید ابلاغی وسائل کی مدد سے کی جاسکتی ہے۔ خصوصاً جمعہ کے عربی خطبے کے آخر میں پڑھی جانے والی سورہ النحل کی آیت (16.90) اور عربی خطبہ کے دیگر اہم اقتباسات کا مفہوم آسان مقامی زبان میں لکھ کر مسجد کے اندر دیوار پر آویزاں کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ نماز جمعہ سے قبل اس کا عام فہم الفاظ میں ترجمہ و مفہوم بیان کر دیا جائے۔ نماز جمعہ میں سورہ فاتحہ کے بعد پڑھی جانے والی آیات کو پہلے سے طے کرلیں اور قبل نماز سامعین سے ان آیتوں کا تعارف، ترجمہ و مفہوم بیان فرما دیں، اس سے مقتدی صاحبان میں نماز کا خشوع، قرآن کی سماعت کا لطف اور اس کی خشیت کا احساس بیدار ہوگا اور نماز کے ذریعہ اللہ کا پیغام ان تک بہ آسانی پہنچتا رہے گا۔

(iv) انتخابی حلقوں و وارڈوں کی حد بندی کا انتخابات کے نتیجہ پر دوررس اثر ہوتا ہے، یہ حد بندی سرکاری افسروں کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں بے توجہی اور عدم معلومات کی وجہ سے ملت کو اپنی سیاسی اہمیت میں اگلے پانچ برس تک خسارہ اور انواع و اقسام کے نقصانات برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں بدستور غفلت تباہیوں کے سلسلہ کو دراز کر کے ملت کی نسلوں کو بے وزن بناتی جارہی ہے۔ ملک میں پارلیمانی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابوں سے ہٹ کر پنچایتوں، نگر پریشدوں، نگر نگموں اور ضلع پریشدوں کے جو انتخابات ہوتے ہیں، اس سے قبل ہر پانچ سالوں میں نئی حد بندی کرنے کی قانونی ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی از سر نو حد بندی کا سلسلہ کسی نہ کسی وجہ سے اکثر چلتا ہی رہتا ہے۔ مرکزی و صوبائی الیکشن کمیشن کی ویب سائٹوں کے ذریعہ ان حد بندیوں پر مستقل عقابی نظر رکھنا اور اس کی نگرانی کرنا اشد ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کے ووٹ قوانین و اصولوں کے خلاف غیر منصفانہ حد بندی کے شکار ہو کر بے وزن اور غیر مؤثر نہ رہ جائیں اور خاطر خواہ فیصد میں مسلمانوں کے ووٹ ہونے کے باوجود اپنی پسند کے امیدواروں کو کامیاب کروانا مشکل یا ناممکن نہ ہو کر رہ جائے۔ اس کام کے لیے بڑے پیمانے پر ایسے افراد کی بھی ضرورت ہے، جن کو مسائل حد بندی کے تمام قوانین و اصولوں کی تربیت دی جائے اور پھر وہ ملک میں جگہ جگہ نگہبانی کرسکیں۔

(v) یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ ہمارا انفرادی مقصد حیات سو فیصد ہمارے یا ہمارے اہل و عیال کی ہی کفالت کرنا نہیں ہے، بلکہ اس میں کم از کم ایک تہائی حصہ ان دیگر لوگوں کا ہے جو ضرورت مند ہیں اور ہماری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ امداد صرف روپے پیسہ کی شکل میں نہیں ہوتی ہے، بلکہ ان کا حصہ ہمارے وقت، ہمارے ذاتی ذرائع، ہماری زمین جائداد اور ہمارے جذبہ محبت میں بھی ہے۔ اس ہدایت کا بنیادی ذکر سورہ بقرہ کی آیت 219 میں آیا ہے، جسے عالمی قدردانی والی تفاسیر کی مدد سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس خدائی فرمان کا نفاذ کرنے کے لیے ہمیں اپنے انتخابی حلقہ میں ہر دن متحرک رہنا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی مدد سے سرکاری و غیر سرکاری فلاحی اسکیموں کو ڈاؤن لوڈ کر کے ان کی نقلیں کرلینی ہیں اور اپنے قرب و جوار میں نظر دوڑا کے ان اشخاص کی نشاندہی کرنی ہے، جو ان اسکیموں سے استفادہ کے مستحق ہیں، ان سے فارم بھروا کے درخواستوں کو ہمیں داخل دفتر بھی کر دینا ہے اور چند روز بعد معلوم کرنا ہے کہ ان پر کارروائی کہاں تک پہنچی۔ ایسا کرنے سے ہم صرف مشیت الٰہی کی پاسداری ہی نہیں کریں گے بلکہ معاشرہ میں باہمی محبت و تعاون کے ذریعہ اپنے سماج کی اندرونی ملمع سازی بھی کرسکیں گے۔ ساتھ ہی یہ ملی استحکام و انجماد آئندہ انتخابات کے وقت اپنے ووٹوں کو متحد رکھ کر ملت کے سیاسی مقام کو مستحکم کرنے کے کام بھی آئے گا۔ (vi) ملک میں ملی نسلوں کی فکری نشوونما اور زندگی کی شاہراہوں پر احکام الٰہی کی روشنی میں ان کی رہنمائی کے لیے عوام میں علامہ اقبالؒ کے کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا کیا جائے، اشعار کو بچوں اور بڑوں کو یاد کرایا جائے اور ان کے مفہوم کو انھیں از بر کرایا جائے، کیونکہ کلام اقبالؒ جابجا در اصل تفسیر قرآنی اور تشریح حدیث ہے، اکثر اس کا تعلق کسی آیت کریمہ، واقعات سیرت مصطفیؐ، دیگر پیغمبران کی سنتوں یا پھر صحابہ کرامؓ و اکابرین و اسلاف کے اسلامی تاریخی پس منظر سے ہے، ان کے اشعار صداقت کے نقیب اور شریعت اسلامی سے مامور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا علی میاںؒ کے علاوہ متعدد عالمگیر شہرت یافتہ علما و دیگر دانشوروں نے اقبالؒ کے اشعار سے صحیح ملی تربیت کی غرض سے استفادہ کی پیروی کی ہے۔ تو چلئے کمر بستہ ہو جاتے ہیں، بقول علامہ:

گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانند شمع سوزاں میان محفل گداز ہو جا

□❖□

خطیب حضرات علما و دیگر دانشوروں کے تعاون سے خود کے اور ساتھیوں کے لیے خطبہ سے متعلق رہنما اصول مرتب کر لیں تاکہ جمعہ کے بیانوں کو زیادہ مفید و مؤثر بنایا جاسکے، اس طرح ان شاء اللہ بہت تھوڑے وقفہ میں ہی ملت کے اندر ضروری بیداری پیدا ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں خطبہ جمعہ کے موضوعات منتخب کر لیں۔

آئینہ.......ضمیر ہاشمی

جن کا دعویٰ تھا کھلائیں گے کمل بنگال میں
اُن کے دعووں کی حقیقت کا پتہ دینے لگے
میزبانی کرنے والے جا ملے دشمن کے ساتھ
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

Rashtriya Sahara 08 June 2017

زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

سول سروسز کا جو نتیجہ مئی 2017 کی آخری شام کو منظر عام پر آیا ہے، اس سے ثابت ہو گیا کہ انسان کا کام اخلاص و یکسوئی سے صحیح طرز پر محنت کیے جانا ہے اور اس کاوش میں اثر ڈالنا اللہ کا ہی کام ہے۔ بیسویں صدی کی نویں دہائی کے شروع میں چودھری محمد عارف، چودھری طیب حسین، سید حامد، شفیع قریشی اور حکیم عبد الحمید مرحومین کی جد و جہد سے دہلی کے لودھی روڈ پر مرکزی حکومت نے پونے دو ایکڑ زمین الاٹ کر دی تھی جس پر دو پرانی بوسیدہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں، انھیں میں ملک بھر سے کسی بھی سرکاری ملازمت میں ذرا بھی دلچسپی دکھانے والے کسی بھی طالب علم کو عارف بھائی ٹھہرنے کی اجازت دے دیتے تھے اور ہم جیسے کچھ لوگوں کو ادھر اُدھر سے بلا کے کبھی کبھی لیکچر بھی کروا دیا کرتے تھے۔ ان کے اسی جتن سے اگلی دو دہائیوں میں سو سے زائد بچوں کو ملک کی چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتیں جوائن کرنے میں کافی مدد ملی۔ زمین کے اس خطہ پر جو انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر قائم ہونا تھا، اس کا بنیادی مقصد تھا سول سروسز میں ملت کے بچوں کو پہنچانے کے لیے ادارہ ساز اقدام کرنا، لیکن اکیسویں صدی کے شروع میں سینٹر کی عمارت مکمل ہونے کے بعد وہ بنیادی کام پروان نہیں چڑھ سکا۔ لیکن ساتھ ہی بیسویں صدی کی آخری دہائی کے شروع میں ہی حکیم عبدالحمید اور سید حامد مرحومین کی مشترکہ دور اندیشی سے دہلی کے تغلق آباد علاقہ میں پچاس کمروں پر مشتمل ہمدرد اسٹڈی سینٹر قائم ہو گیا تھا اور اس میں ملک بھر سے سول سروسز میں دلچسپی رکھنے والے 50 طلبا سال بہ سال یکجا کیے جانے لگے۔ ان سب کوششوں سے یہ ہوا کہ ہر سال یو پی ایس سی کے ذریعہ سلیکٹ کیے جانے والے افسران کی تعداد میں بتدریج اضافہ کے ساتھ ساتھ کامیاب مسلم طلبا کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور اس طرح سول سروسز میں مسلمانوں کی فیصد 3-2.5 سے کم نہیں ہوئی اور قائم رہی۔ اللہ ان تمام حضرات کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے، آمین۔

جولائی 1977 کے دوران میں نے سول سروس جوائن کرنے کے بعد سے ہی انفرادی طور پر اس مخصوص تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا، مثلاً سال میں دو تین دفعہ چھٹی لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہوسٹلوں میں جا کر طلبا سے گفت و شنید کر کے انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا، ناگپور میں تعیناتی کے دوران اس کام کے لیے میں اور محکمہ کسٹمس کے سابق چیف کمشنر طارق غوری، پروفیسر صغیر احمد انصاری وان کے ساتھیوں کے ہمراہ اکثر شام کو قابل طلبا کے گھر جاتے تھے، اس کثیر جہتی تگ و دو میں الحمدللہ انفرادی کامیابیاں بھی خوب ملیں۔ لیکن نومبر 2006 میں سچر کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے کے بعد میں نے اور میرے رفقا نے طے کیا کہ اب یہ کام ادارہ ساز انداز میں ہی کرنا ہوگا۔ سچر کمیٹی نے اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ تو بتایا ہی کہ مسلمان تعلیمی، اقتصادی اور سماجی میدانوں میں بشمول شیڈولڈ کاسٹ کے سب سے کافی پیچھے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس کی بڑی وجہ ہے ملک کی حکمرانی میں مسلمانوں کی خفیف نمائندگی۔ سچر کمیٹی نے کہا کہ پارلیمنٹ، اسمبلیوں اور لوکل باڈیز میں متناسب مسلم نمائندگی کے فقدان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ انتخابی حلقے اور وارڈ جہاں مسلمانوں کا فیصد زیادہ ہے انھیں شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا سچر کمیٹی نے سفارش کی کہ آزادی کے بعد سے چلی آ رہی اس گڑبڑی کو دور کرنے کا کام حد بندی کمیشن یا پری سیمن آیوگ (Delimitation Commission) کو سونپ دیا جائے، اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ یہ کام طے شدہ وقت میں مکمل کر دے۔ لیکن نہ یو پی اے حکومت نے اس بنیادی سفارش پر کوئی دھیان دیا نہ این ڈی اے نے جبکہ میں نے اپنے پرزنٹیشن، بیانات، ٹی وی مباحثوں اور خطوط کے ذریعہ دونوں وزرائے اعظم اور اہم ترین سیاسی لیڈروں تک متعدد دفعہ یہ ایشو پہنچا دیا۔ تب ہم لوگوں نے طے کیا کہ اس عظیم کام کا بیڑا اب ملت کو خود ہی اٹھانا ہوگا۔ اس لیے 2012 سے ہم نے زیڈ آئی میں ہی ایک حد بندی سیل قائم کر دیا، اب ہماری ملک گیر تحقیق آخری مراحل میں ہے اور جلد ان شاءاللہ اس کام میں آگے کارروائی ہوگی۔ ساتھ ہی 2007 میں ہم لوگوں نے زیڈ ایف کے تحت سر سید کوچنگ اینڈ گائیڈنس سینٹر فار سول سروسز قائم کر دیا جس کے نتائج میں سال بہ سال الحمدللہ بہتری آتی جا رہی ہے۔ یاد رکھئے کہ سول سروسز کی کوچنگ کے لیے سب سے کامیاب ادارے دہلی میں ہی قائم ہیں، اسی لیے دہلی کے مکھرجی نگر کے قریب ہم نے لڑکوں کے لیے تین ہوسٹل قائم کیے اور اس کے نزدیک لڑکیوں کے عیسائی ہوسٹل میں کم قیمت پر اپنی بچیوں کے لیے جگہ لے لی۔

اس کے علاوہ اب تک ملک کے مختلف صوبوں و ضلعوں میں 27 دفعہ سول سروس رخ بندی و تربیتی پروگرام (Orientation Program) کیے جا چکے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں سیکڑوں کی تعداد میں طلبا نے شرکت کی ہے۔ حکومت ہند کے سبکدوش سکریٹری سراج حسین نے ایک سال قبل وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے زیڈ ایف آئی جوائن کر کے سول سروس کے کام میں چار چاند لگا دیے۔ علاوہ ازیں حیدرآباد کی مولانا آزاد نیشنل اوپن یونیورسٹی، جے پور کی جامعہ ہدایت، ممبئی کی مرکزی حج کمیٹی اور چنئی کی مرکزی جامع مسجد میں بھی سول سروسز کی کوچنگ کا کام شروع ہوا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں حکومت کی مدد سے اقلیتوں اور شیڈولڈ کاسٹ کے امیدواروں کے لیے کوچنگ کا انتظام ہے، جس کا جزوی استفادہ مسلمانوں کو بھی ملتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ضخیم رہائشی کوچنگ اکیڈمی (Residential Coaching Academy) ہونے کے باوجود وہاں سے حالیہ برسوں میں سول سروس کے میدان میں خاطر خواہ کامیابی دکھائی نہیں پڑی ہے، سابق وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ نے اپنے دور کے آخر میں اس طرف کچھ توجہ دی تھی، قوی امید ہے کہ نئے وی سی پروفیسر طارق منصور اس کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ اس کام کے لیے وہاں کی ایگزیکیٹو کاؤنسل نے قرارداد پاس کر کے مجھے اور بزرگ پروفیسر حبیب الرحمٰن کو یہ کام سونپا ہے جس پر ہم نے آرسی اے کے ساتھ مل کے کارروائی شروع کر دی ہے۔ پورے ملک میں گزشتہ برس سول سروس میں کامیاب مسلمانوں کی تعداد 38 تھی جو کہ آزادی کے بعد سے اب تک کی سب سے بڑی تعداد تھی لیکن مئی 2017 میں اعلان شدہ سول سروسز کے نتیجہ سے معلوم ہوا کہ امسال 1,099 میں سے 50 کامیاب امیدوار مسلمان ہیں یعنی کہ 4.54 فیصد۔ یقیناً یہ اثر برسہا برس کی چوطرفہ ملی کاوشوں کا ہے، لیکن ہمیں مطمئن و آسودہ خاطر (Complacent) ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ ایک تو مردم شماری 2011 کے مطابق ہماری آبادی 14.2 فیصد ہے جس کے ایک تہائی پائیدان پر بھی ہم ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔ دوسرے، ملک گیر سطح پر جتنی کوششیں ہونی چاہئیں، اتنی اب بھی نہیں ہوئی ہیں۔ ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ اب تک کی کاروائی عموماً ان طلبا کے لیے ہوئی ہے جو گریجویشن یا اس سے زیادہ ڈگری حاصل کر چکے ہیں یا کرنے والے ہیں، لیکن ساتھ ہی ایک اور متوازی کوشش کی ضرورت ہے۔ اسکولوں میں زیر تعلیم جو بچے آٹھویں جماعت پاس کر لیں، ان میں سے جو پانچ فیصد قابل ترین ہوں، انھیں چن کے ان کو 20-15 بچوں کے گروپوں میں تقسیم کرنا ہے اور ان پر خصوصی توجہ دینی ہے۔ انھیں نویں سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن تک کی تعلیم حاصل کرنی ہی ہے لیکن اس 9-7 برس کے تعلیمی سفر کے دوران ہر روز 3-2 گھنٹے انھیں ایسی مخصوص پڑھائی بھی کرنی ہے جو آگے چل کے ان کے سول سروس کے امتحان میں کام آئے گی۔ اس نصاب میں شامل ہوگا روز ایک گھنٹے انگریزی کا 'ہندو'، اخبار پڑھنا اور الگ رجسٹر میں اس پر نوٹس تیار کرنا، این سی ای آر ٹی (NCERT) کی نویں سے بارہویں جماعت تک کی سائنس، حساب، سماجیات اور انگریزی کی کتابوں کا مطالعہ و مشق اور سول سروسز امتحان سے متعلق معلومات عامہ (General Studies) کی ایک کتاب (TMH or Pearson) اپنے پاس رکھنا اور روز اس میں سے تھوڑا تھوڑا پڑھ کر یاد کرنا۔ جو بچے ایسا کرتے رہیں گے، ان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ آگے چل کے سول سروس میں کامیاب نہ ہوں۔ میری اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے گزشتہ برس کرناٹک کے بیجاپور میں ایک ہوسٹل قائم ہو گیا ہے جس میں پندرہ بچے ایک ساتھ رہ کے اس مخصوص نصاب کے مطابق اضافی مطالعہ کر رہے ہیں، اس کو ہم سول سروس کی جونیئر فیلوشپ کہتے ہیں۔ آیئے آگے بڑھیے، بقول اقبالؔ:

راز حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

❒❖❒

”سچر کمیٹی نے اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ تو بتایا ہی کہ مسلمان تعلیمی، اقتصادی اور سماجی میدانوں میں بشمول شیڈولڈ کاسٹ کے سب سے کافی پیچھے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس کی بڑی وجہ ہے ملک کی حکمرانی میں مسلمانوں کی خفیف نمائندگی۔ سچر کمیٹی نے کہا کہ پارلیمنٹ، اسمبلیوں اور لوکل باڈیز میں متناسب مسلم نمائندگی کے فقدان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ انتخابی حلقے اور وارڈ جہاں مسلمانوں کا فیصد زیادہ ہے انھیں شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو کر دیا گیا ہے۔“

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 22 Jun-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

حد بندی سے متعلق ہمیں غفلت سے باہر آجانا چاہیے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

سچر کمیٹی اور مشرا کمیشن دونوں نے دستاویزوں کی بنیاد پر خوب صاف طور پر بتادیا ہے کہ ہمارے ملک میں سماجی، اقتصادی اور تعلیمی طور پر مسلمان سب سے پیچھے ہیں اور اس کی بڑی وجہ ہے ملک کی سیاسی وانتظامیہ سے متعلق حکمرانی میں ان کی نمائندگی کا فقدان۔ سول سروسز میں مسلم نمائندگی میں کمی کا تو ذکر گاہے بگاہے ہونے لگا ہے اور مجموعی ملی کاوشوں کا کچھ اثر بھی الحمدللہ دکھنے لگا ہے، لیکن سیاسی نمائندگی میں مسلمانوں کی کثیر غیر موجودگی اب بھی اندرون ملت بحث کا موضوع نہیں بن سکی ہے۔ دستور ہند کے تحت لوک سبھا کے پہلے انتخابات 1952 میں ہوئے تھے، اس وقت ملک کی کل آبادی 35.6 کروڑ تھی، لوک سبھا میں 489 ممبر تھے اور اس میں سے 21 مسلمان تھے جبکہ اس وقت سرکاری اعدادوشمار کے مطابق مسلمانوں کی قومی آبادی 9.91 فیصد تھی، اس لیے لوک سبھا میں اس وقت 49 مسلم ممبر ہونے چاہئیں تھے۔ مردم شماری 2001 کے مطابق ہمارے ملک کی کل آبادی 102.7 کروڑ تھی، جس میں سے 13.4 فیصد مسلمان تھے۔ حد بندی 2008 کے مطابق لوک سبھا کی ایک سیٹ اوسطاً 18.9 لاکھ آبادی پر مختص کی گئی تھی۔ لہٰذا اگر صرف مسلم آبادی کو 18.9 لاکھ سے تقسیم کیا جائے تو لوک سبھا میں مسلمانوں کی 83 سیٹیں بنتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسلم آبادی پورے ملک میں مختلف فیصدوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس زمینی حقیقت کو مدنظر رکھا جائے تو جس کو ہندی میں 'مسلم بہولیہ چھیتر' کہتے ہیں، یعنی وہ انتخابی حلقے جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ باثر ہو، ان کی تعداد 122 ہونی چاہیے۔ لیکن حد بندی ایسی کی گئی کہ 2009 کے لوک سبھا الیکشن میں صرف 29 مسلمان کامیاب ہوئے۔

معلوم یہ ہوا کہ انتخابی حلقوں اور وارڈوں کی حد بندی (Delimitation) کی عام گڑبڑی کے علاوہ یہ بھی سلسلہ چل رہا ہے کہ جہاں مسلمان بڑی فیصد میں ہوں، ان انتخابی حلقوں کو شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو کردیا جاتا رہا ہے، جبکہ ایسا کرنا حد بندی قانون و ضابطہ کی صریح خلاف ورزی ہے۔ سولہویں لوک سبھا (2014) کے انتخابات میں جس طرح سماجی قطب سازی ہوئی، اس سے لوک سبھا میں مسلم ممبروں کی تعداد اور گھٹ گئی۔ اُدھر حد بندی قانون 2008 کے مطابق اب 2026 کے بعد ہونے والی پہلی مردم شماری یعنی 2031 تک لوک سبھا کے انتخابی حلقوں کی حد بندی کو منجمد (Freeze) کردیا گیا ہے، یعنی اس میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ جھارکھنڈ اسمبلی کی حد بندی میں تبدیلی کو بھی اسی طرح 2026/2031 تک روک دیا گیا ہے۔ آسام، اروناچل پردیش، ناگالینڈ اور منی پور کے لیے یہ کہا گیا کہ وہاں ایسے حالات ہیں کہ جس سے ہندوستان کی سلامتی، اتحاد، امن و امان اور انتظام عام کو خطرہ ہے، اس لیے وہاں تازہ حد بندی کا کام اگلے احکامات تک ملتوی رکھا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر موجودہ حد بندی میں دستور ہند، قوانین یا ضابطہ کے کچھ خلاف ہے تو اس کے ازالہ پر روک لگی ہو۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آگے کے برسوں میں جو حد بندی کی کارروائی ہونے والی ہے، اس سے متعلق زمینی تیاری فی الوقت نہ کی جائے۔ دراصل انتخابی حلقوں کی حد بندی کا موضوع کچھ سوکھا ہے اور زیادہ تر لوگوں کو اس کی اہمیت کا اندازہ بھی نہیں ہے۔

لیکن یہ لاعلمی ایسی ہی ہے جیسے کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے خون میں کینسر کے عناصر سرایت کرگئے ہیں، اگر بروقت معلومات ہوجائے اور صحیح علاج ہوجائے تو آگے کی زندگی خوشگوار ہوسکتی ہے، لیکن معلومات ہی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ علاج کی جب نوبت آئے گی تب تک بہت دیر ہوچکی ہوگی اور زندگی دکھ سے بھر سکتی ہے۔ یہی حال ملت اسلامیہ کا ہے وارڈوں اور انتخابی حلقوں کی حد بندی کے تعلق سے، اگر معلومات نہیں ہوگی تو علاج نہیں ہوگا۔ اس خلا کو کسی حد تک پر کرنے کے لیے ZakatIndia.org پر حد بندی سے متعلق ایک سیکشن شروع کردیا گیا ہے اس میں وقتاً فوقتاً معلومات فراہم کی جاتی ہے، حق اطلاع قانون کے تحت معلومات حاصل کرنے کے لیے خط کا نمونہ بھی وہاں دیا گیا ہے۔ اس کو پڑھ کے قارئین کو چاہیے کہ اپنے علاقہ میں کارروائی کریں۔ ورنہ فی الحال تو حد بندی کے کام پر تعینات افسرشاہی اور اسٹاف یہ جانتے ہیں کہ کسی کو اس کام کی جانچ پڑتال کرنے میں دلچسپی نہیں ہے اور ہم جیسا چاہیں سیاہ سفید کرتے رہیں اور عوامی حقوق کی جڑ بھی کاٹ سکتے ہیں۔ گریٹر بمبئی میونسپل کارپوریشن کے الیکشن حال میں ہوئے، اس سے قبل زیڈ ایف آئی نے معلومات حاصل کی کہ وہاں 227 وارڈ ہیں، جس میں مسلم ممبر اُس وقت صرف 23 تھے جبکہ آبادی کے مطابق یہ تعداد 35 ہونی چاہیے۔ مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ وہاں 17 ریزروڈ وارڈوں میں شیڈولڈ کاسٹ کا فیصد کم ہے اور دیگر 24 وارڈ ایسے ہیں، جہاں شیڈولڈ کاسٹ کا فیصد تمام 17 ریزروڈ وارڈوں سے زیادہ ہے، پھر بھی انھیں ریزرو نہیں کیا گیا۔ اسی کے ساتھ 30 علیحدہ وارڈوں میں حد بندی کے رولس کی خلاف ورزی کی گئی تھی، جس پر باقاعدہ اعتراض داخل کر کے زیڈ ایف آئی نے ان وارڈوں کی حدود کو حتی الامکان ٹھیک کروایا، ورنہ نتیجے اور بھی زیادہ ملت مخالف ہوتے۔

”الیکشن کے ذریعہ ملی فلاح کی دیوار کی پہلی اینٹ ہے انتخابی حلقوں اور وارڈوں کی صحیح حدبندی۔ اس کام کے لیے ہر انتخابی حلقہ میں آپس میں پانچ ملی کارکنوں کی ایک کمیٹی تشکیل کر لیجیے، ایسے اشخاص جن کے دل میں ملت کے لیے بے لوث محبت ہو۔ معلوم کیجیے کہ مردم شماری 2011 کے مطابق آپ کے انتخابی حلقہ کی کل آبادی کتنی ہے، اس میں سے مسلم آبادی کہاں کہاں کتنی کتنی ہے۔“

اگلے دو برس میں لوک سبھا اور صوبائی اسمبلیوں میں الیکشن اس طرح ہونے والے ہیں: 2017 میں گجرات، 2018، جنوری میں ناگالینڈ اور تریپورا، مارچ میں کرناٹک، اپریل میں میگھالیہ، مئی میں ہماچل پردیش، دسمبر میں ہریانہ اور اروناچل پردیش۔ 2019 کے شروع میں ہی لوک سبھا الیکشن، مارچ میں چھتیس گڑھ اور سکم، اپریل میں آندھراپردیش، مئی میں مدھیہ پردیش، جون میں تلنگانہ، جولائی میں مہاراشٹرا اور ستمبر میں اڑیسہ۔ قارئین اپنے صوبہ کی تاریخیں برائے مہربانی نوٹ فرمالیں اور اب سے الیکشن تک کا ٹائم ٹیبل مرتب کرلیں کہ کس تاریخ تک کون سا انفرادی اور اجتماعی مثبت عمل کب ہوجانا چاہیے۔ یہ کوشش ذاتی یا خالص سیاسی نقطہ نظر سے نہیں ہونی ہے، بلکہ پورے طور پر ملت کے دوررس مفاد میں ہونی ہے۔ ہر الیکشن کو اپنی زندگی کا ایک اہم جز بنا لیجیے، جیسے بچہ کی نشوونما میں سنگ میل مقرر ہوتے ہیں کہ کب اس کی بسم اللہ ہوگی، کب اسکول میں داخلہ، کب مولوی صاحب اور ٹیوٹر آئیں گے، آگے کیا مضامین پڑھوانے ہیں، اسے زندگی میں کیا بنوانا ہے وغیرہ۔ اسی طرح آپ کی پوری زندگی میں کچھ کچھ عرصہ کے بعد کوئی نہ کوئی الیکشن ہونا ہے، جس کا دیرپا اثر ملت کی فلاح پر پڑنا ہی ہے۔ اس لیے اپنے بچے کی طرح ہمیں ملت سے بھی محبت ہونی چاہیے اور اس کی بہبود کے لیے ہر الیکشن کو ملت کے حق میں کارگر بنانے کے لیے طویل مدتی تگ ودو کرنی چاہیے، خواتین کو اس کام میں برابر کی دلچسپی لینی ہوگی، امام وخطیب صاحبان اس کو خطبہ کا موضوع بنائیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر پہلی اینٹ ٹیڑھی ہوئی تو اس پر دیوار اوپر تک ٹیڑھی ہی بنے گی۔ الیکشن کے ذریعہ ملی فلاح کی دیوار کی پہلی اینٹ ہے انتخابی حلقوں اور وارڈوں کی صحیح حد بندی۔ اس کام کے لیے ہر انتخابی حلقہ میں آپس میں پانچ ملی کارکنوں کی ایک کمیٹی تشکیل کر لیجیے، ایسے اشخاص جن کے دل میں ملت کے لیے بے لوث محبت ہو۔ معلوم کیجیے کہ مردم شماری 2011 کے مطابق آپ کے انتخابی حلقہ کی کل آبادی کتنی ہے، اس میں سے مسلم آبادی کہاں کہاں کتنی کتنی ہے، کل آبادی کا مسلم فیصد کتنا بنا، 2008-09 میں حلقہ کی حد بندی ہوئی تھی کہ نہیں، اگر ہوئی تو اس کا اثر مسلم مفاد پر کیا پڑا، اگر نہیں ہوئی تو کس طرح کی حد بندی ہونی چاہیے تھی، تاکہ مسلم حق تلفی ختم ہوجائے۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ مسلم مفاد کے مدنظر ہر الیکشن میں سو فیصد ملی ووٹنگ کروانا ہے، اس کے لیے آنے والی عید کے بعد سے ہی نقل وحرکت شروع ہوجائے۔ ووٹ دینے کی اہمیت لوگوں کو سمجھانے کے لیے اور یہ بتانے کے لیے کہ ووٹنگ کے اتحاد میں ملت کے کیا کیا فائدے ہیں۔ فکر کیجیے 2047 کی جب آزادی کو 100 برس ہوچکے ہوں گے اور اب کے بعد لوک سبھا کے 6 اور صوبائی اسمبلیوں کے درجنوں الیکشن ہوچکے ہوں گے، کیا اقبال کی طرح کسی اور کو اللہ کی طرف سے جوابِ شکوہ دینے پر مجبور کردیں گے کہ 'ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمھیں پیاری ہے۔'

❒❖❒

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آراان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

مسلم کش واقعات اور ہماری ذمہ داریاں

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

ستمبر 2015 تا جون 2017 ملک میں مختلف جگہوں پر 20 ایسے واقعات ہوئے ہیں جب ایک بھیڑ نے مسلم مخالف نعرے لگاتے ہوئے ایک مسلمان کو جان سے مار دیا، سولہ سال کے بچے جنید کی یہ بیسویں واردات ہے۔ اور کتنے واقعات ہونے چاہئیں یہ ماننے کے لیے کہ یہ سب ایک سوچے سمجھے پلان کے تحت کیا جارہا ہے اور یہ کوئی اچانک گھٹی ہوئی گھٹنائیں نہیں ہیں۔ پھر بھی 27 جون کو مر رناؤٹی وی چینل (MirrorNow TV Channel) پر رمن ملک یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ جنید کا قتل مذہب کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ حالانکہ جنید کے بھائی اسی ٹی وی پر بتا رہے تھے کہ قتل کرنے والوں نے دونوں بھائیوں کی مسلم ٹوپی زبردستی اتار کے پھینک دی اور گالی دے کر بے جا الزام تراشی کی کہ تم بیف کھانے والے لوگ ہو۔ ٹی وی بحث کے پینل میں دیگر اشخاص نے کہا کہ ایسا لگ رہا ہے کہ گویا ملک میں اقلیتوں کے شکار کی سازشیں چل رہی ہوں اور اس کے لیے وحشی ذہنیت کو نفرت وتشدد کی فحش نگاری میں ڈھالا جارہا ہو اور اوپر بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس روش کو روکنے میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ انھوں نے آگاہ کیا کہ اگر ایک طبقہ جمہوری اقدار کو بالائے طاق رکھ سکتا ہے تو دوسرے طبقے کب تک اس عدم توازن پر قائم رہ سکیں گے۔ بات شروع ہوئی تھی ستمبر 2015 میں دادری کے اخلاق سے اور اسی برس اکتوبر میں اودھم پور میں زاہد رسول بھٹ سے۔ خون کے پیاسے لوگوں کا جھنڈ کہیں بھی پہنچ جاتا ہے: جھارکھنڈ، ہریانہ، راجستھان، یو پی، مدھیہ پردیش، آسام، جموں وکشمیر۔

اس پر انگریزی روزنامہ انڈین ایکسپریس نے 27 جون کو اپنے اداریہ میں تعجب وتشویش کا اظہار کیا ہے کہ صوبوں اور مرکز میں موجودہ حکومتیں ملک میں قومیت اور ہندوستانیت کی تعریف اور اس کے ٹسٹ سے متعلق مستقل ڈھول بجاتی رہتی ہیں اور اس طرح کے کسی واقعہ کی تفتیش میں پوری پولیس فورس حرکت میں آجاتی ہے اور کوشش رہتی ہے کہ ان میں کسی مسلمان کا ملوث ہونا دکھائی پڑنے لگے جبکہ وہی حکومتیں اب ایک کے بعد ایک واقعات میں بھیڑ کے ذریعہ معصوم مسلمانوں کے قتل پر خاموش ہیں۔ تشدد کے ان واقعات کی ظاہری آوارگی اور ان کی عمومیت وفرسودگی کی وجہ سے ان واقعات کو پہلے سے کوشش کرکے نہ ہونے دینا قدرے مشکل لگتا ہے، لیکن پھر بھی حکومت کے پاس اس معاملہ میں کچھ نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے، ورنہ نتیجہ یہی اخذ ہونا ہے کہ تشدد تو ضرور بھیڑ کے ذریعہ کیا جاتا ہے لیکن بھیڑ کو تنفس حکومت سے ملتا ہے۔ اداریہ میں آگے لکھا گیا ہے کہ برسر اقتدار جماعت کو اپنے سے یہ سوال پوچھنا پڑے گا کہ اس کو الیکشن جیتنے کے لیے اگر مسلم ووٹ نہیں بھی چاہئیں تو کیا دستور ہند کے تحت اس پارٹی کا جواز بن جاتا ہے کہ مسلمانوں کو پاگل بھیڑ کے سامنے پروس دیا جائے۔ اس ضمن میں یہ بھی سوال پوچھنا واجب ہے کہ صدر جمہوریہ کی افطار پارٹی میں مرکزی حکومت کا کوئی بھی وزیر شامل کیوں نہیں ہوا، کیا اس 'بائیکاٹ' سے جنید کے قاتلوں کو شہ نہیں ملی ہوگی۔ یوگا کو ملک بھر میں سرکاری خرچ پر زبردست فروغ دیے جانے اور یو پی میں قبرستانوں کی حفاظتی کارروائی پر اعتراض کے درمیان دستوری تضاد سے عام ناخواندہ شہری اور خصوصاً تشدد آمیز متعصب ذہنیت رکھنے والے بے روزگار نوجوانوں کو کیا سبق ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جنید اور اس کے بھائیوں پر ریل گاڑی میں قاتلانہ حملہ کے بعد آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی رہنمائی میں پورے ملک کی سرکردہ شخصیات نے مسلمانوں سے کہا کہ عید کے دن بازو پر کالی پٹی باندھ کر نماز پڑھنے جائیں، اس پر پورے ملک میں زبردست اثر ہوا اور ساتھ ہی جمعیۃ علماء ہند نے احتجاجاً اپنا عید ملن کا پروگرام منسوخ کر دیا، ان کے ان اعمال صالحہ سے حضور اقدسؐ کے حکم کی تعمیل ہوتی ہے جہاں انھوں نے فرمایا کہ جب تم کوئی غلط کام ہوتے ہوئے دیکھو تو اسے اپنے ہاتھ سے ٹھیک کردو اور اگر تم ایسا نہیں کرسکتے تو اس کو ٹھیک کرنے کے لیے اپنی زبان کا استعمال ضرور کرو۔

”بی جے پی نے 2014 کے پارلیمانی الیکشن سے قبل اپنے منشور میں بھی لکھا تھا کہ دهشت گردی، شدت پسندی، گھس پیٹھ اور جرائم کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کیے جائیں گے، لیکن جنید کے قتل کے بعد (جو اس سلسلہ کا بیسواں قتل ہے) وزیرصاحب پھر وہی جملہ دوہرا کے سمجھ رہے ہیں کہ حق ادا ہوگیا۔ اس سے زیادہ ہلکا بیان اس طرح کے سنگین جرم کے لیے ہو نہیں سکتا۔“

بھلا ہو امام جامع مسجد فریدآباد مولانا محمد رمضان اور ان کے رفقا کا جو راتوں رات لوگوں کو جگا کے لے گئے اور بلبھ گڑھ کے ضروری طبی ساز وسامان سے غیر مربوط یون اسپتال سے جنید کے زخمی بھائی کو نکال کر تیزی سے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز دہلی کے ٹراما سینٹر میں اسے منتقل کیا اور اس طرح اللہ نے اس کی جان بچالی۔ وہ لوگ گورنمنٹ ریلوے پولیس کے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل آلوک رائے سے بھی ملے اور ان سے ملزمین کی جلد گرفتاری، ٹرینوں میں کیرتن بھجن کا سلسلہ ختم کروانے، ریل گاڑیوں میں پولیس کے جوانوں کی تعیناتی، ریل گاڑی کے اندر سینئر جی آر پی افسروں کے نام وفون نمبر لکھوانے اور ریل کے ڈبوں کے اندر کیمرے (CCTV) لگوانے کی مانگ کی۔ اس میٹنگ میں ایس پی نے کہا کہ جنید کو مارنے والا شخص اس وقت نشہ میں تھا تو امام صاحب نے پوچھا کہ یہ کیسے معلوم ہوا؟ کیا آپ نے اس وقت اس کی سانس کا ٹسٹ کروایا تھا؟ اس پر احکامات دیے گئے کہ رپورٹ میں یہ نہیں لکھا جائے کہ ملزم موقع واردات پر نشہ میں تھا اور ساتھ ہی دیگر ملزمین کے بارے میں معلومات دینے والے کو ایک لاکھ روپے کا اعلان بھی کیا گیا۔ ہریانہ وقف بورڈ کے چیئرمین نے جنید کے خاندان کے لیے پانچ لاکھ روپے کی امداد کا اعلان کیا اور فریدآباد کے ڈپٹی کمشنر نے بھی اتنی ہی مزید رقم کا چیک دے دیا۔ اب ہریانہ کے وزیراعلیٰ بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ متاثرہ خاندان کو دس لاکھ روپے دیں گے۔ وقف کا پیسہ تو مسلمانوں کا ہی ہے اور دوسری رقم بھی اس خزانہ سے آتی ہے، جس میں عوام کے ٹیکس شامل ہیں۔

سوال یہ ہے کہ تمام ملزمین کو پکڑ کے اگر جلد سخت سزا نہیں دی گئی تو ان جیسے لوگوں کے حوصلے اور بڑھ سکتے ہیں اور ساتھ ہی مسلمانوں اور ان کے بہی خواہوں کے صبر کے پیمانے کا اچھال بھی۔ مرکزی وزیر قانون روی شنکر پرساد نے صرف اتنا کہا کہ جنید کا قتل بہت تکلیف دہ وشرم ناک واقعہ ہے اور حکومت اس طرح کے حملوں کو برداشت نہیں کرے گی، اگر کوئی تشدد کرتا ہے یا کسی کا قتل کرتا ہے تو قانون اپنا کام کرے گا۔ بی جے پی نے 2014 کے پارلیمانی الیکشن سے قبل اپنے منشور میں بھی لکھا تھا کہ دہشت گردی، شدت پسندی، گھس پیٹھ اور جرائم کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کیے جائیں گے، لیکن جنید کے قتل کے بعد (جو اس سلسلہ کا بیسواں قتل ہے) وزیر صاحب پھر وہی جملہ دوہرا کے سمجھ رہے ہیں کہ حق ادا ہوگیا۔ اس سے زیادہ ہلکا بیان اس طرح کے سنگین جرم کے لیے ہو نہیں سکتا۔ حکومت کو اس جرم کو دہشت گردی اور آتنک واد کا نام دینا چاہیے۔ بی جے پی کے منشور میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ملک میں ایک پر امن ماحول قائم کرے گی جس میں سب کو تحفظ حاصل ہوگا اور جہاں شرپسندوں کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ لیکن ایک کے بعد ایک مسلمان قتل ہوتے چلے جارہے ہیں، پارٹی اس تضاد کی کیا تشریح پیش کرے گی۔

ملت کے لیے دنیا میں اس سے بھی پیچیدہ موڑ آئے ہیں، لیکن ان تمام آزمائشوں کو ملت نے قبول کیا ہے اور اس پر ملت کھری اتری ہے۔ قلیل وقتی ذاتی سیاسی فروغ کے لیے اگر کچھ لوگ ملک و دنیا کے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھنا چاہتے ہیں تو بھی اس سے ملت کا کوئی طویل مدتی نقصان ہونے والا نہیں ہے، بشرطیکہ افراد ملت اپنے دینی فرائض پورے کرتے رہیں اور اپنے ملک کے دستور کی مکمل اطاعت بھی کرتے رہیں۔ آیئے فریدآباد کے مولانا رمضان سے سبق لیں، اگر ایک فرد کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو پوری ملت اور پورا سماج اس کی مدد کے لیے تعینات رہے۔ قرآن کریم (2.69) میں ہم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر ہم صراط مستقیم پر چلیں گے تو نہ ہمیں خوف ہوگا اور نہ ہم غمگین ہوں گے۔ دریں اثنا انفرادی اور ملی حفاظت کے لیے جو ضروری احتیاط کرنی ہو، اس سے بالکل گریز نہ کریں۔ ملت کی طرف سے تنبیہ کی جانی چاہیے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ ان غیر انسانی گھٹیا وارداتوں سے مسلمان کا حوصلہ پست ہوجائے گا، بلکہ ان تند ہواؤں سے تو پرواز اور اونچی ہوجاتی ہے، مسلمان خوف کرنے والا نہیں ہے، اس کا ایمان کامل ہے۔ بقول اقبالؔ:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

آنے والی عیدالاضحیٰ: خدشات وانتظامات

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”سپریم کورٹ نے جانور کی قربانی پر پابندی لگانے سے انکار کردیا۔ اس کے باوجود زبردست منفی پروگرام کے تحت ملک میں ایسی ہوا پھیلائی گئی ہے کہ گویا صرف مسلمان ہی جانور کو ذبح کرتے ہیں اور اس طرح وہ ظالم ہیں اور انہیں اس کام سے روکنا چاہیے۔ اس حد تک کہ کسی جانور کے ذبیحہ کے شبہ پر بھی 50-100 نوجوانوں کا دستہ آتا ہے اور ایک مسلمان کو پکڑ کے سر عام موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔“

عیدالاضحیٰ 2017 میں ہم مسلمانان ہند کے لیے دونوں طرح کے امتحان ہونے والے ہیں، وہ امتحان جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہوا تھا اور وہ بھی جو ان کے فرزند کا ہوا تھا۔ لہٰذا سمجھداری اس میں ہے کہ ہم ابھی سے خوب غور وخوض کر کے لائحہ عمل طے کریں، تاکہ ہم ان دونوں امتحانوں میں سرخ روئی حاصل کریں۔ اہل وطن نے بات شروع کی تھی گائے کے ذبیحہ کی ممانعت سے، لیکن معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے پلان کا صرف تمہیدی بیان (Preamble) تھا۔ اس بہانے پورے ملک میں ایسے فعال دستوں کی تشکیل ہوگئی چوکسی کرنے کے لیے کہ کوئی گئوکشی تو نہیں کر رہا ہے۔ غور کریں کہ گاؤں ومحلوں میں 50-100 بے روزگار نوجوانوں کو یہی روزگار مل گیا ہے کہ کڑی نظر رکھیں کہ کہیں گئوکشی سے متعلق کوئی کام تو نہیں ہو رہا ہے اور اگر دور دور تک کہیں اس کا شبہ بھی ہو تو اس کو روکیں۔ ان کے پاس ہتھیار بھی ہیں، بدمست ہونے کے لیے شراب بھی، ان میں مخبر بھی ہیں اور ’اچھی کارروائی‘ کے بعد انھیں مخصوص مراعات سے نوازا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام پر تعینات یہ نوجوان سرکاری ملازم نہیں ہیں، لیکن اس معاملہ میں فی الحال ہمارا پیارا ہندوستان پڑوسی ملک چین کے طرز عمل پر گامزن ہے، جہاں حکومت اور برسر اقتدار جماعت کے درمیان تفریق کے حجاب اتنے باریک ہیں کہ (علامہ سے معذرت کے ساتھ) نمایاں ہیں ’امارت، کے تبسم ہائے پنہانی‘ اگر کسی شہری کے گھر کے فرج میں رکھے ہوئے گوشت کے بیف ہونے کا شبہ بھی ہو تو وہ قریب ترین چوکسی دستے کے ذریعہ متحرک ہوکر حملہ کرنے کے لیے کافی جواز ہے۔ حال میں عید الفطر سے قبل خبر آئی تھی کہ ہریانہ میں پولیس والوں کو گھر میں ہانڈی کا معائنہ کرنے کے احکامات ہوئے ہیں، دروغ برگردنِ راوی۔

بہر حال اس خلاف معمول دستور شکنی کے پس منظر میں پہلی دفعہ عید الاضحیٰ آ رہی ہے، یعنی مسلمانوں کا دوسرا سب سے بڑا تہوار جب وہ اپنے جدِّ امجد کی خدا پسند قربانی کی یادگار کو تازہ کرنے کے لیے خود کسی جانور کی قربانی کرنے میں روحانی خوشی محسوس کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے رِگ ویدا میں مجوزہ اَشوا میدھا یعنی گھوڑے کی قربانی کے مطابق مہابھارت میں کرکشیتر کی جنگ جیتنے کے بعد یودِشٹھِر نے یہ قربانی پیش کی تھی۔ تامل معاشرہ میں آج بھی جانور کی قربانی کا رواج ہے، زمانہ سنگم کی مشہور ادبی کتاب ترو مُروگرُپٹئی میں ہندو خدا مُروگن یا سُبرامنیا کی عبادت کے لیے جانور کی قربانی کی اہمیت تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ راجستھان میں نوراتری کے دوران برہمن پجاری کے ذریعہ کُل دیوتا کو بھینس یا بکری کی قربانی پیش کی جاتی ہے۔ کرناٹک میں رینوکا دیوی کو بھی یہی قربانی پیش کی جاتی ہے۔ مہاراشٹرا کے کٹھریا کوتادی ہندو فرقہ میں بچہ پیدا ہونے کے بعد دیوی سپتشرنگی کو بکرے کی قربانی پیش کی جاتی ہے، اس کے بعد ہی بارہویں دن نوزائیدہ بچہ کا نام رکھا جاتا ہے۔ آسام، مغربی بنگال اور نیپال کے بھی ہندو مندروں میں بکرے، مرغے یا بھینس کی قربانی ہوتی ہے۔ بنگال میں قربانی سے قبل جانور کے کان میں پجاری گائتری منتر بھی پڑھتے ہیں۔ نیپال کے گدھی مئی تہوار کے دوران بڑی بھیڑ جمع ہوتی ہے اور کئی لاکھ جانور قربان کیے جاتے ہیں۔ اڑیسہ کے بودھ ضلع میں کندھین بُدھی کی پوجا ہوتی ہے اور بکرے کی قربانی کی جاتی ہے اور سمبل پور کے سملیشور مندر میں سملیشوری دیوی کے لیے بکرے کی قربانی ہوتی ہے۔ کیرالہ کے مالابار علاقہ میں تھِیّم دیوتا کو مرغے کی قربانی پیش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حال میں سپریم کورٹ نے جانور کی قربانی پر پابندی لگانے سے انکار کردیا۔ اس کے باوجود زبردست منفی پروگرام کے تحت ملک میں ایسی ہوا پھیلائی گئی ہے کہ گویا صرف مسلمان ہی جانور کو ذبح کرتے ہیں اور اس طرح وہ ظالم ہیں اور انھیں اس کام سے روکنا چاہیے۔ اس حد تک کہ کسی جانور کے ذبیحہ کے شبہ پر بھی 50-100 نوجوانوں کا دستہ آتا ہے اور ایک مسلمان کو پکڑ کے سر عام موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ گزشتہ دو برس میں یہ 21 دفعہ ہوچکا ہے۔ ایسی صورت حال میں بقرعید آ رہی ہے جبکہ پورے ملک کے مسلمان جانور کی قربانی کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ تو کیا ہم لاکھوں گاؤں اور قصبوں میں مسلمانوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیں۔

سورۃ الصافات (37.102-107) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام و ان کے فرزند کے مطابق درج ہے (بمطابق تفسیر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ) کہ جب وہ لڑکا ان کے ساتھ دوڑ بھاگ کر ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گیا تب حضرت ابراہیمؑ کو اسے اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی بشارت ہوئی، یعنی وہ شئے قربان کرنے کی جو ان کے لیے سب سے زیادہ کارآمد تھی اور انھیں سب سے زیادہ عزیز بھی تھی۔ پھر جب وہ باپ بیٹے اس امتحان میں پاس ہو گئے تو اللہ نے اپنی رحمت کاملہ سے بیٹے کی جگہ دنبے کو لٹا دیا۔ یہاں ہمیں جو اصل سبق مل رہا ہے وہ ہے اپنی سب سے زیادہ پسندیدہ اور اپنے لیے سب سے زیادہ کام آنے والی چیز کو اللہ کی خوشنودی کی خاطر ضرورت مند لوگوں کے لیے پیش کر دینا۔ زمانہ ابراہیمی میں مویشیوں کی تعداد ہی انسانوں کی دولت و ان کی انفرادی و خاندانی خوشحالی اور اقبال مندی کا پیمانہ ہوتی تھی۔ مشہور عالم مفسر عبداللہ یوسف علیؒ کے مطابق اپنے پسندیدہ جانور کو قربان کر کے اس کا گوشت ضرورت مندوں، اہل خاندان اور دوست احباب میں تقسیم کرنا دور ابراہیمی میں اللہ کے بندوں سے انسان کی بے لوث محبت جتانے کا سب سے اہم طریقہ تھا۔ قرآن کریم میں (22.37) یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ قربانی کے جانور کا گوشت یا اس کا خون اللہ تک نہیں پہنچتا ہے، بلکہ اس کے پیچھے جو تقویٰ کی نیت ہے وہ پہنچتی ہے۔

لہٰذا آج بھی اگر کچھ لوگ ریگستان کے ایک چھوٹے قصبے میں رہائش پذیر ہیں، جہاں گوشت خوری زندگی گزارنے کا ضروری حصہ ہے تو یقیناً وہاں اس کا سیاق وسباق (Context) موجود ہے اور وہاں جانور کی قربانی برمحل ہے۔ لیکن دور جدید کے ہر سماج میں کیا قربانی کا گوشت ہی ضرورت مندوں، دوست احباب اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا جانا ضروری ہے یا اس رقم سے کسی غریب و بے سہارا یتیم مریض کا علاج کروایا جا سکتا ہے، اس ایشو پر عالم اسلام کے علمائے کرام کے ذریعہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حضور اقدسؐ خود بھی زیادہ تر کھجور اور جو نوش فرماتے تھے اور گوشت ان کی روزمرہ کی غذا نہیں تھی۔ قرآن کریم (6.38) میں یہ بھی ذکر ہے کہ زمین پر چلنے والے جانور اور پروں سے اڑنے والے پرندے سب کے ہی انسانوں کی طرح کے گروہ ہیں، وہ سب بھی پروردگار کے یہاں جمع کیے جائیں گے۔ بخاری شریف میں حدیث نبویؐ ہے کہ جو شخص اللہ کی مخلوق پر رحم کرتا ہے وہ گویا اپنے پر ہی رحم کر رہا ہے۔ لیکن بہرحال ہمارے ملک عزیز میں تو قربانی صدیوں سے ہوتی آ رہی ہے اور یہ معاملہ ابھی تک ہندوستانی علمائے کرام کے مابین زیر بحث بھی نہیں ہے، ساتھ ہی ہمیں قربانی سے متعلق ہندوستان میں موجودہ مسلم مخالف شرپسندی کے ماحول کو بھی ذہن میں رکھنا ہے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 13 Jul-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

ہمیں رکھنی ہوگی، آہٹ پہ آنکھ در پہ نظر

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”سچر کمیٹی نے اعداد و شمار کی بنیاد پر بتایا کہ تعلیمی میدان میں مسلمان باقی سب سے بہت پیچھے ہیں کیونکہ ان کے لیے تعلیمی اداروں کی سخت قلت ہے۔ لہٰذا خالی پڑی جائدادوں کے دنیاوی مالکوں کو چاہیے کہ وہ ان جائدادوں کو تعلیمی ادارے چلانے کے لیے پیش کر دیں۔ اس طرح ملت کو اپنی خود کی ا مداد کا دائرہ وسیع تر کرنا ہوگا، جو یقینا قوم کے مفاد میں ہوگا۔“

آٹھویں درجے سے اوپر تک کی پوری تعلیمی امداد کے لیے مرکزی وزارت برائے انسانی وسائل کی نئی اسکیم سویم کے نام سے نکلی ہے، اس سے اپنے بچوں کو استفادہ پہنچانے کے لیے وزارت کی ویب سائٹ swayam.gov.in پر جانا ہوگا۔ اس سے باقاعدہ زیر تعلیم بچے جو پڑھائی میں کمزور ہیں، وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور وہ بچے بھی جنھوں نے اب تک کوئی تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ اسی طرح سے وزارت کی ایک اور ویب سائٹ ہے swayamprabha.gov.in جس پر چوبیس گھنٹے اعلیٰ درجے کے تعلیمی پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ ان پروگراموں کا مواد مہیا کیا جاتا ہے این آئی او ایس (NIOS)، این سی ای آر ٹی (NCERT)، اگنو (IGNOU) وغیرہ کے ذریعہ۔ مرکزی وزارت الیکٹرانکس و انفارمیشن ٹیکنالوجی نے عمومی خدمات مراکز (CommonServicesCenter-CSC) قائم کرنے کی ایک اسکیم چلائی ہے، جس کی تفصیل csc.gov.in پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ان مراکز کے ذریعہ ہر گاؤں میں حکومت کی تمام اسکیموں کو گاؤں تک پہنچایا جاتا ہے۔ کوئی بھی مقامی باشندہ جس کی عمر 18 برس یا اس سے زیادہ ہو اور جس نے کسی ریکگنائزڈ بورڈ سے دسویں جماعت پاس کر رکھی ہو، مقامی زبان بول اور لکھ سکتا ہو اور انگریزی پر کسی درجہ عبور رکھتا ہو، کمپیوٹر پر کام کرنا جانتا ہو، جس کے پاس ایک کمپیوٹر ہو اور اس میں لائسنس شدہ WindowsXP-SP-2 ہو، 120GB کی ہارڈ ڈسک ہو، 512MBRAM کے علاوہ پرنٹر، اسکینر، ڈیٹا کارڈ، ڈیجیٹل کیمرا اور یو پی ایس ہو، وہ خود CSC قائم کرنے کی درخواست دے سکتا ہے، اس کے ذریعہ وہ آدھار کارڈ بنانے کے لیے ڈیٹا بھی جمع کرسکتا ہے اور گاؤں کے لوگوں کی تاجرانہ چارہ جوئی (Entrepreneurship) میں سرکاری امداد بھی مہیا کرواسکتا ہے یا کرواسکتی ہے۔

سی ایس سی سینٹر قائم کرنے کے لیے ایسے عرضی گزار کو اپنا پین کارڈ (Pan Card) اور اپنے رہائشی پتے کا ثبوت اپلوڈ کرنا ہوتا ہے تاکہ اسے حکومت کی طرف سے ایجنٹ کوڈ (Agent Code) الاٹ کیا جاسکے۔ یہ سینٹر لوگوں کے پین کارڈ بنوانے یا اس میں تبدیلی کروانے کی درخواستیں لے کر اپلوڈ کر سکتا ہے اور پھر پین نمبر حاصل کرکے لوگوں کو دے سکتا ہے۔ پاسپورٹ کے لیے درخواست اور اس کی فیس وغیرہ سبھی کام سی ایس سی کے ذریعہ ہوسکتے ہیں۔ اسی کے ذریعہ لوگ اپنا انکم ٹیکس ریٹرن، انشورنس پریمیم، پنشن کے کاغذات، این آئی او ایس میں اپنی درخواست داخل کر سکتے ہیں، الیکشن کارڈ بنوا سکتے ہیں اور بجلی اور پانی کے بل کی ادائیگی بھی کر سکتے ہیں۔ سی ایس سی لوگوں کے لیے ڈیجیٹل لاکرس (Digital Lockers) بھی مہیا کرسکتا ہے، جس میں لوگ اپنے ضروری ریکارڈ، دستاویز، سرٹیفکیٹ وغیرہ حفاظت سے اپلوڈ کر سکتے ہیں۔ سی ایس سی کے ذریعہ ریل، بس اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ بک ہوسکتے ہیں، موبائل فون اور ٹی وی کا ریچارج بھی ہوسکتا ہے، زراعتی خدمات سے استفادہ، خرید و فروخت اور انگریزی سیکھی جا سکتی ہے و دیگر تعلیمی کورسز بھی کیے جاسکتے ہیں۔ کمپیوٹر سیکھنے کے مخصوص تعلیمی کورسز وزارت کی ویب سائٹ nielit.gov.in پر موجود ہیں، جہاں سے ان کا فائدہ لیا جاسکتا ہے اور دوسروں تک بھی پہنچایا جاسکتا ہے۔ ملک بھر میں NIELIT کے مراکز قائم ہیں جہاں کمپیوٹر سیکھنے سے متعلق چھوٹے بڑے سبھی کورس کروائے جاتے ہیں اور سرکاری سرٹیفکیٹ ملتا ہے۔

مرکزی حکومت کے اعلیٰ ترین دفتر کیبنٹ سیکریٹریٹ (Cabinet Secretariat) نے 15 جون 2017 کو تمام صوبائی چیف سکریٹریوں کو لکھا ہے کہ صوبوں میں زمین جائداد کے تمام ریکارڈ کو 14 اگست 2017 تک ڈیجیٹل کردیا جائے اور ہر پلاٹ اور جائداد کو اس کے مالک (فرد، ادارہ، سوسائٹی، ٹرسٹ، وغیرہ) کے آدھار نمبر سے جوڑ دیا جائے اور اس کے متعلق جائداد رجسٹری دفتر اور میونسپل رجسٹر و پٹواری کے ریکارڈ میں داخل خارج (Mutation) کے مابین تال میل بٹھادیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرکزی حکومت قانون بنا کر تمام زمین جائداد کی ملکیت کو آدھار نمبر سے جوڑنا چاہتی ہے اور اس کے بعد جو زمین جائداد اس طور پر آدھار کارڈ سے منسلک نہیں پائی جائیں گی، ان کے مالکوں کے خلاف بے نامی لین دین ممانعت قانون 2016 کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ اس خط کی نقل وزیراعظم کے دفتر کو بھیجی گئی ہے۔ اس کارروائی سے اوقاف کے مستثنیٰ ہونے کا خط میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس طور پر فریقین کے پاس کام زیادہ ہے، وقت کم۔ جن این جی اوز کو بیرون ملک سے امدادی رقم منگانی ہوتی ہے، انھیں اپنے این جی او کو فارن کانٹری بیوشن ریگولیشن قانون (FCRA) کے تحت رجسٹر کروانا ہوتا ہے اور ہر سہ ماہی پر مرکزی وزارت داخلہ میں ریٹرن داخل کرنا ہوتا ہے۔ حال میں ایسے کیس نظر میں آئے ہیں جہاں ایف سی آر اے کا رجسٹریشن موجود ہے پھر بھی باہر سے آنے والی رقم بغیر کسی وجہ کے لوٹادی گئی ہے، اس کی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ ایسا ہوا ہو، وہ اگر ایک دوسرے سے رائے مشورہ کریں گے تو سب کو استفادہ ہوگا۔

تقریباً چالیس برس پرانی بات ہے کہ میرے برادر بزرگ راشد صاحب ایک دفعہ بہرائچ ریلوے اسٹیشن پر بینچ پر بیٹھے ہوئے ٹرین کے آنے کے منتظر تھے، انھوں نے دیکھا کہ قریب ہی تین افراد کھڑے ہوئے محو گفتگو تھے اور کیلے کھا کر چھلکے وہیں پلیٹ فارم پر ہی گراتے جا رہے تھے۔ جب وہ لوگ کیلے کھا چکے تو راشد بھائی خاموشی سے اٹھے اور ان کے پاس جا کر زمین پر بیٹھ کر چھلکے اٹھا کے پاس کے کوڑے دان میں پھینک دیے، وہ لوگ شرمندہ ہوئے اور معافی مانگی۔ چند برس قبل میں بین الاقوامی سفر سے واپس آ رہا تھا، ہوائی جہاز میں میرے پیچھے کی سیٹ پر ذرا زیادہ ڈیل ڈول کے ایک اہل وطن بیٹھ کر مستقل میری سیٹ پر پیر مار رہے تھے، میں نے ایک دو دفعہ پیچھے گھوم کے دیکھا پھر بھی ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، میں نے طے کرلیا کہ میں صرف صبر کروں گا اور اب ان سے کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا، انھیں دن کی روشنی میں سونے میں دقت پیش آ رہی تھی تو میں نے اپنے بیگ میں سے آسانی سے سو جانے کے لیے آنکھوں پر لگانے کا ماسک نکال کر ان کو پیش کر دیا، پھر تو وہ صاحب میرے گرویدہ ہوگئے۔ آیئے ہم اپنا قومی مزاج بنالیں کہ اہل وطن کو ہم وقتاً فوقتاً پھول اور تحفے تحائف بھیجتے رہا کریں گے۔ ساتھ ہی ملک میں ہر مسجد کے چاروں طرف چالیس یعنی کل 160 مکانوں میں رہنے والوں کا ریکارڈ مسجد کمیٹی کے اراکین اور امام و موذن صاحبان کے پاس باقاعدہ ہونا چاہیے تاکہ تند ہواؤں کے چلتے ہوئے باہمی امداد بہ آسانی پہنچائی جاسکے۔ دوران امن بھی علاقہ میں ضرورت مندوں کی مدد کے کام کو مسجد کمیٹی اپنی ذمہ داری سمجھے۔ کچھ افراد کو خاموشی سے لیکن گہری نظر رکھنی ہوگی کہ کہیں زمین پر فساد پھیلانے کی سازش و تیاری تو نہیں ہو رہی ہے۔

گزشتہ پانچ سات برس سے جنوبی ہندوستان کے تاجروں و سرمایہ کاروں کا ایک مسلم چیمبر آف کامرس بنا ہوا ہے وہ حتی الامکان کچا مال اپنے ممبروں سے ہی خریدتے ہیں اور اپنا تیار کردہ مال بھی اپنے اراکین کو ہی فروخت کرتے ہیں۔ اس عرصہ میں ان میں سے ہر ایک کے کاروبار میں خوب برکت ہوئی اور ان سب کے کاروبار میں غیر معمولی اضافہ ہوا، اس ماڈل کو اور جگہ بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ ملک بھر میں لاکھوں لوگوں کی جائدادیں استعمال میں نہیں آ رہی ہیں اور ان میں تالے لگے ہوئے ہیں جبکہ سورہ البقرہ (2.239) میں صاف حکم ہے کہ تمھیں اللہ نے جو کچھ دیا ہے، اس میں سے صرف اتنا ہی اپنے پاس رکھو جتنے سے تمہاری اور تم پر منحصر اہل و عیال کی ضروریات پوری ہوتی ہوں، باقی سب تمہارا ہے ہی نہیں بلکہ اس پر دیگر ضرورت مند لوگوں کا حق ہے۔ سچر کمیٹی نے اعداد و شمار کی بنیاد پر بتایا کہ تعلیمی میدان میں مسلمان باقی سب سے بہت پیچھے ہیں کیونکہ ان کے لیے تعلیمی اداروں کی سخت قلت ہے۔ لہٰذا خالی پڑی جائدادوں کے دنیاوی مالکوں کو چاہیے کہ وہ ان جائدادوں کو تعلیمی ادارے چلانے کے لیے پیش کر دیں۔ اس طرح ملت کو اپنی خود کی امداد کا دائرہ وسیع تر کرنا ہوگا، جو یقیناً قوم کے مفاد میں ہوگا۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 20 Jul-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

پوپ فرانسس کی اتحادی تگ ودو ہند کے تناظر میں

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

پروفیسر مائیکل کیلیبر نے کہا کہ صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے میکسیکو اور امریکہ کے درمیان دیوار بنانے کی بات کہی لیکن پوپ فرانسس دیواریں گرانے اور پل بنانے کی بات کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں پوپ کے دوروں کے اشتہارات میں جو علامتی نشان بنائے جاتے ہیں اس میں عیسائی صلیب کے ساتھ اسلامی ہلال بھی ہوتا ہے۔ اس طرح پوپ فرانسس نے دنیا کو پیغام دیا ہے کہ بین المذاہب ڈائیلاگ کے ذریعہ آپسی مقابلہ کو باہمی تعاون و امداد میں تبدیل کر دیا جائے۔ لہٰذا ہمیں پوپ فرانسس کی مثال کو اپنا نصب العین بناکر دنیا میں آگے بڑھنا ہوگا۔

رواں

ہفتہ میں انٹرفیتھ کوئیلشن فار پیس کی جانب سے دہلی کے انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں امریکہ کی بوناونچر یونیورسٹی کے مرکز برائے عرب و اسلامی تدریس کے ڈائریکٹر پروفیسر فادر مائیکل کیلیبر یا نے 'پوپ فرانسس اور اسلام' کے عنوان پر لکچر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ موجودہ پوپ کا اصلی نام ہے جارج میریو برگوگلیو لیکن انھوں نے اپنا پاپائی نام (Papal name) رکھ لیا ہے فرانسس' وہ اس وجہ سے کہ پانچویں صلیبی جنگ کے دوران 1219 میں اس وقت اٹلی کے شہر اسیسی کے رہنے والے سینٹ فرانسس ضد کر کے یوروپی فوج کے ساتھ مصر کے دمیاط (Damietta in Egypt) گئے تھے، انھوں نے یوروپی فوج کو مسلمانوں پر حملہ کرنے سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ بہر حال یوروپی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، جس کے بعد سینٹ فرانسس جنگ کی لائن پار کر گئے، جہاں انھیں قید کر کے سلطان ملک الکامل کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں ان کے مابین اگلے بیس روز تک عبادات و صوفیانہ طرز زندگی پر گفت وشنید کے بعد انھیں احساس ہوا کہ مسلمان اور عیسائی دونوں ہی خدا پرست ہیں۔ جاتے وقت سلطان نے فرانسس کو ہاتھی دانت کی بنی ہوئی شہنائی پیش کی جو سین فرینسسکو' اسیسی کی باسلیقی کے تہ خانہ (Crypt of Basilica at San Fransesco) میں اب بھی محفوظ ہے۔ سینٹ فرانسس کے نام پر اپنا پاپائی نام رکھ کر موجودہ پوپ نے دنیا کو یہ پیغام دے دیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے اور گفت وشنید کے ذریعہ تمام باہمی معاملات کا حل نکالا جائے۔ پوپ نے صاف کہا کہ جب آپ مسلمانوں سے رجوع کریں تو ان کے طور طریقہ کا لحاظ رکھیں اور ان کے ذہن میں اپنے لئے اعتماد پیدا کریں، ان کو بیش قیمت انسان مانئے اور ان کی بات غور سے سنئے۔

اس کے بعد 2016 اور 2013 میں ہولی ویک کے دوران پوپ فرانسس نے جن غریب ضرورت مند لوگوں کو ویٹیکن (Vatican) میں پیر دھونے کی سالانہ روایت کے لئے چنا ان میں پہلی دفعہ عورتوں اور مسلمانوں کو بھی شامل کیا۔ ویٹیکن سے جاری کردہ 2014 کے اعلان انجیل (Proclamation of Gospel) میں پوپ نے مسلمانوں کے ذریعہ کی جانے والی دعاؤں کو بھی شامل کیا اور زور دیا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان محبت و اخوت کو فروغ دینے کے لئے دنیا بھر میں زمینی سطح پر اقدامات کئے جائیں۔ انھوں نے عیسائیوں کی برتری والے ممالک سے کہا کہ وہ شام سے بے گھر ہوئے لوگوں کو گلے لگائیں اور اپنے یہاں پناہ دیں۔ 2014 میں ہی پوپ فرانسس اسلامی امام اور یہودی پادری کو ساتھ لے کر دونوں کی کمر میں ایک ایک ہاتھ ڈالے ہوئے یروشلم میں قبۃ الصخرہ (Dome on the Rock) اور مسجد الاقصیٰ گئے اور وہاں انھوں نے مسلمانوں کو بھائی کہتے ہوئے خطاب کیا۔ اسی برس ترکی میں پوپ نے مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی۔ 2015 میں سری لنکا میں پوپ نے یاد دلایا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے مابین باہمی احترام، تعاون اور دوستی میں ہی انسانیت کی فلاح ہے۔ انھوں نے 2015 کو رحم کا سال (Year of Peace) کے طور پر منانے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ قرآن میں اللہ کی اولین صفات اس کی رحمانیت اور اس کی رحیمیت بتائی گئی ہے۔

میانمار میں روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کو جنگ قرار دیتے ہوئے پوپ فرانسس نے کہا کہ یہ یکطرفہ تشدد اور ہلاکت ہے، صرف اس وجہ سے کہ مقتولین کا مذہب اسلام ہے۔ اسی برس وہ نیویارک میں گراؤنڈ زیرو پر بھی ایک امام اور ایک یہودی پادری کے ساتھ گئے۔ دہلی کے اسلامک سنٹر میں اپنی تقریر کے دوران پروفیسر مائیکل کیلیبر یا نے کہا کہ پوپ فرانسس کے پیغام کی اہمیت دور حاضر کے ہندوستان میں پہچاننے اور اس سے سبق لینے کی بڑی ضرورت ہے۔ مذہبی تنوع (Religious diversity) کو ہی ملکی اتحاد کی بنیاد بنایا جانا چاہئے اور اس کے لئے مذہب کی بنیاد پر نفرت اور نام نہاد انتقامی جذبہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہوگا اور سیاسی تنازع کو مذہبی رنگ دینے سے گریز کرنا ہوگا۔ 2016 میں پوپ فرانسس نے مصر جا کر الاظہر کے امام سے ملاقات کی، میڈیا کے لوگوں نے ان سے کہا کہ اس موقع پر آپ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں، جس پر پوپ نے کہا کہ یہ ملاقات ہی دنیا کے لئے میرا پیغام ہے۔ مسلمانوں سے اچھے تعلقات بنا کے رکھنا سب سے زیادہ اہم ہے۔ بعد میں ہوائی سفر کے دوران جہاز میں نامہ نگاروں نے ان سے پوچھا کہ اسلامی تشدد کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے جس پر پوپ فرانسس نے جواب دیا کہ ان کے ملک اٹلی میں ہر روز تشدد ہوتا رہتا ہے جو سو فیصد عیسائیوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے لیکن کوئی اسے عیسائی تشدد نہیں کہتا ہے تو کوئی تشدد اسلامی بھی نہیں کہا جانا چاہئے۔ پروفیسر مائیکل کیلیبر یا نے یاد دلایا کہ اپنے پورے آٹھ برس کی مدت میں امریکی صدر اوباما نے کبھی بھی 'اسلامی تشدد' کے الفاظ نہیں کہے اور یہ کہ ہم کبھی عیسائی تشدد یا یہودی تشدد نہیں کہتے ہیں حالانکہ ایسا کہنے کا مستقل جواز بنا رہتا ہے۔

پروفیسر مائیکل کیلیبر یا نے مزید کہا کہ دنیا کے اقتصادی سسٹم کے استفادہ سے بڑی تعداد میں انسانوں کو خارج کر دیا گیا ہے، اس لئے یہ اقتصادی سسٹم ہی تشدد کی اصل جڑ ہے۔ 2016 میں ہی آزر بائیجان میں پوپ نے کہا کہ دوسروں کے لئے اپنے دروازے کھول دینے سے ہی خود کی تزئین و افزودگی ہے۔ اسی برس روم میں پوپ نے کہا کہ عربی اور عبرانی دونوں زبانوں میں لفظ رحم کے بنیادی معنی ماں کی کوکھ ہے جہاں نشو ونما پانے کے بعد انسان دنیا میں آتا ہے، لہٰذا دنیاوی امن کی شروعات وہیں سے ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ خدا کی اولین صفت رحم کرنے کی ہے اور وہ انسانوں سے بھی یہی امید کرتا ہے۔ پروفیسر مائیکل کیلیبر نے کہا کہ صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے میکسیکو اور امریکہ کے درمیان دیوار بنانے کی بات کہی لیکن پوپ فرانسس دیواریں گرانے اور پل بنانے کی بات کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں پوپ کے دوروں کے اشتہارات میں جو علامتی نشان بنائے جاتے ہیں اس میں عیسائی صلیب کے ساتھ اسلامی ہلال بھی ہوتا ہے۔ اس طرح پوپ فرانسس نے دنیا کو پیغام دیا ہے کہ بین المذاہب ڈائیلاگ کے ذریعہ آپسی مقابلہ کو باہمی تعاون وامداد میں تبدیل کر دیا جائے۔ لہٰذا ہمیں پوپ فرانسس کی مثال کو اپنا نصب العین بنا کر دنیا میں آگے بڑھنا ہوگا۔

لیکن ہمارے ملک ہندوستان میں تو فی الحال سڑکوں پر ایک مذہب والوں کی بھیڑ کے ذریعہ دوسرے مذہب کے بیچارے ایک معصوم شخص کو پکڑ کر مار کے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس سانحہ پر عموماً کسی کی گرفت بھی نہیں ہوتی ہے۔ اس سے دو مذاہب کے مابین نفرت کو فروغ ملتا ہے اور اس طرح بقول پوپ فرانسس سیاسی مطلب پرستی کو مذہبی اختلاف کا لباس پہنایا جا رہا ہے۔ اس سے پورے ملک کی آب وہوا اور انسانی نفسیات بھی خراب ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب انفرادی مفاد کے لئے ہندوستان میں لوگ دوسرے انسان کے خلاف بدترین جرم کرنے سے تجاوز نہیں کرتے۔ خبریں آ رہی ہیں کہ دہلی میں شری رام کالج کے استاد اشونی کمار نے طالب علم پردیپ پھوگٹ کو فیل کر دیا، اس لئے پردیپ نے استاد کو تھپڑ اور گھونسے مارے، پولیس نے پردیپ کو گرفتار کیا اور اسی روز اس کو ضمانت پر رہائی مل گئی۔ سی بی ایس سی کے ذریعہ انجینئرنگ میں داخلہ کے لئے کئے گئے IIT-JEE امتحان کے پرچہ کو آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک طالب علم جیک فریزر نے آدھے ہی وقفہ میں سو فیصد صحیح حل کر دیا جس پر عوام کی ایک پسندیدہ ویب سائٹ کورا (Quora) پر ہندوستانیوں کے ذریعہ جیک فریزر اور ان کی والدہ کو مغلظات سے نوازا گیا۔ لائن آف کنٹرول پر میجر شکھا تھاپڑ نے ڈیوٹی کے دوران سیل فون استعمال کرنے پر نائک کاٹھی ریسن کو ڈانٹ لگائی تو جوان نے اے کے 47 سے میجر صاحب کو گولی سے مار دیا۔ اگر ہندوستان میں ہمیں سماجی فلاح کی فکر ہے تو عوام' سیاست دانوں اور سرکارتیوں کو پوپ فرانسس کے مشورہ پر عمل کرنا ہوگا۔ □❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 03 Aug-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

’من کی بات‘ میں ’بھارت چھوڑو‘ نعرے کا ذکر خیر

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”دنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جس کی جغرافیائی حدود کئی صدیوں تک ایک ہی رہی ہوں، ان میں دیر سویر تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دنیا کو ملکوں میں اس وجہ سے بانٹا گیا ہے تاکہ انسانوں کے انتظامات میں آسانی ہو سکے۔ ملکوں کی باگ ڈور کس کو دی جائے اس کے لیے جمہوری نظام قائم کیا گیا۔“

وزیراعظم نے گزشتہ اتوار کو اپنی من کی بات میں کہا ہے کہ جس طرح 9 اگست 1942 کو ہندوستانیوں نے انگریزوں کو ’بھارت چھوڑو‘ یا ’کوِٹ انڈیا‘ (Quit India) کہہ کر ہندوستان چھوڑنے کے لیے کہہ دیا تھا اور یہ ایک مہم بن گئی تھی، اسی طرح سے ہمیں اب 2017 میں اپنے ملک سے گندگی، غریبی، بدعملی (Corruption)، تشدد (Terrorism) اور فرقہ واریت (Communalism) کو ’بھارت چھوڑو‘ کہہ کر ہندوستان سے انھیں نکالنا ہوگا۔ یقیناً مودی جی کا یہ نعرہ بہت خوش آئند ہے اور اس کی پذیرائی کی جانی چاہیے، لیکن یہ صرف نعرہ ہی نہ رہ جائے، اس کے لیے گہرائی میں جانا ہوگا کہ کس کو کیا کارروائی کرنی چاہیے کہ ملک سے یہ خرابیاں دور ہوجائیں۔ گندگی دور کرنے کے لیے تو وزیراعظم کا نعرہ ہی کافی ہے کہ لوگوں کو اپنا ذہن ہی بدلنا ہوگا اور خودغرضی چھوڑنی ہوگی، اسی سے ہی ملک میں صفائی کی سطح اوپر چلی جائے گی۔ خدا کرے لوگ اس پر عمل کرنے لگیں۔ غریبی کے دور کرنے کا نعرہ بہت پہلے اندرا گاندھی نے دیا تھا، لیکن اس سے ملک میں اس نعرے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ غریبی ہٹانے کے لیے دستور کے آرٹیکل 39(b) اور (c) پر عمل کرنا ضروری ہے، جس کے مطابق سماج کے مادّی ذرائع کو تمام شہریوں میں اس طور پر تقسیم کیا جانا چاہیے کہ وہ مفاد عامہ کے فروغ میں بہترین طریقہ سے معاون ہو۔ ساتھ ہی ملک کا اقتصادی نظام ایسا بنایا جانا چاہیے کہ اس کی وجہ سے ملک کی دولت اور پیداوار کے ذرائع چند لوگوں کے ہاتھوں میں سمٹ کے نہ رہ جائیں، جس کی وجہ سے عوام کی آمدنی میں خسارہ نہ ہوجائے، پیداوار کے ذرائع میں کچا مال بھی آتا ہے اور مشینیں واوزار بھی۔ لیکن آج تک کسی بھی مرکزی حکومت نے اور کسی بھی سیاسی جماعت نے ایسی اقتصادی پالیسی نہیں بنائی، نہ ایسی کوئی وکالت کی جس سے دستور کے مندرجہ بالا آرٹیکل پر عمل ہو سکے۔

اگر واقعی ملک سے غریبی کا خاتمہ کرنا ہے تو، چاہے وہ پلاننگ کمیشن ہو یا نیتی آیوگ، اقتصادی پالیسی میں زبردست بدلاؤ لانا ہوگا۔ مثلاً یہ قانون بنانا ہوگا کہ کسی ایک شخص کی سالانہ آمدنی اور اس کی دولت متفقہ رقوم سے زیادہ نہیں ہوں گی، کسی ایک کمپنی یا فرم وغیرہ کی بھی سالانہ آمدنی کی اوپری سطح پر روک لگانی ہوگی۔ سرکاری ٹھیکوں پر بھی روک لگانی ہوگی کہ کسی ایک برس میں معینہ رقم سے زیادہ کے ٹھیکے کسی ایک شخص یا کمپنی یا فرم کو نہیں ملنے چاہئیں۔ فی الوقت انکم ٹیکس قانون کے تحت 10 لاکھ سالانہ آمدنی سے زیادہ پر 30 فیصد انکم ٹیکس لگتا ہے، اس سے زیادہ آمدنی اگر ہو تو ٹیکس پر زیادہ سے زیادہ 15 فیصد سرچارج لگتا ہے۔ یعنی کہ اگر کسی (X) کی سالانہ آمدنی 50 کروڑ ہے تو اس پر ٹیکس اور سرچارج لگنے کے بعد اس کے پاس 32 کروڑ سے زیادہ کی رقم بچتی ہے۔ اس کے برعکس جس (Y) کی سالانہ آمدنی صرف 50 لاکھ ہے اس کے پاس ٹیکس دینے کے بعد صرف 23 لاکھ ہی بچتے ہیں۔ یہ تفریق اگر ہمارے موجودہ وزیراعظم دور کردیں تب ملک سے غریبی کا خاتمہ ہوگا، اس کے لیے صرف دستور کے آرٹیکل 39(b) اور (c) کی اطاعت کرنی ہوگی اور اس کے تحت موجودہ انکم ٹیکس قانون میں ترمیم کرنی ہوگی۔ ملک سے بدعملی دور کرنے کی شروعات سیاستدانوں سے ہی ہونی ہے کیونکہ جن کے رتبے ہیں سِوا اُن کو سِوا مشکل ہے۔ سیاسی جماعتوں اور امیدواروں کے ذریعہ سرمایہ داروں سے مالی امداد لینے اور ان کے ہیلی کاپٹروں کا استعمال کرنے والے امیدوار ہی سرکاری کرسیوں پر بیٹھتے ہیں، اس طرح نیچے تک سرکاری عملہ کو پیغام چلا جاتا ہے کہ ایسا کرنا غیر مناسب نہیں ہے، وہیں سے بدعملی جڑ پکڑنے لگتی ہے۔ پھر ملک کی اقتصادی پالیسی میں دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ گنجائش رکھنا کہ ملک کی دولت چند ہی لوگوں کے ہاتھوں میں منجمد رہے اس سے بھی سماج میں بدعملی کو فروغ ملتا ہے۔ اگر ان امور میں تبدیلی آئے تو بدعملی دور ہونے کی سمت میں یہ بڑے اقدام ہوں گے۔

تشدد کے عمل تخلیق (Genesis) پر بھی گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے، جس کی جغرافیائی حدود کئی صدیوں تک ایک ہی رہی ہوں، ان میں دیر سویر تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دنیا کو ملکوں میں اس وجہ سے بانٹا گیا ہے تاکہ انسانوں کے انتظامات میں آسانی ہو سکے۔ ملکوں کی باگ ڈور کس کو دی جائے اس کے لیے جمہوری نظام قائم کیا گیا، حالانکہ کہیں بادشاہت بھی ہے اور کہیں دیگر طرح کی شخصی فرمانروائی۔ لیکن تاریخ و حال دونوں یہ بتاتے ہیں کہ چند افراد اور گروپ سیاست کو اپنا اولین پیشہ بنا لیتے ہیں اور بظاہر جمہوری لیکن خفیہ طور پر معیوب طریقہ سے بہ ہر صورت ملک پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے ہیں چاہے اس کے آلہ کے طور پر ملک کی اہمیت کو انسانوں کی اہمیت سے اونچا ہی کیوں نہ اٹھا دینا پڑے۔ اسی کی ایک تازہ مثال ہے ڈونالڈ ٹرمپ کا نعرہ ’امریکہ اول‘ (America First) یعنی کہ امریکہ کے قومی مفاد کو دنیا بھر کے انسانی مفاد پر فوقیت دی جائے گی حالانکہ یہاں ’امریکہ، کے اصل معنی ان کے ذہن میں وہ ہیں اور ان کا خاندان ہے۔ ایک ملٹری اکیڈمی کے کیمپس میں جنرل صاحب پیدل گزر رہے تھے اور ہر کیڈٹ کے سیلیوٹ کے جواب میں کہتے تھے ’وہی آپ کے لیئے‘۔ ان کے ساتھی نے اس جواب پر تعجب کا اظہار کیا تو بولے کہ بظاہر تو یہ مجھے سیلیوٹ کر رہے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ در اصل اس وقت ان لوگوں کے ذہن میں میرے لیے کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ذاتی سیاسی مفاد کو قومی مفاد کا نام دے کر اس کے پیروں تلے انسانی مفاد کو کچلتے ہوئے جب ملٹری کارروائی ہوتی ہے تو ستم زدہ لوگوں کے ذریعہ خفیہ جوابی کارروائی کو اکثر دنیا میں تشدد کا نام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر متعلقہ علاقہ کے لوگوں کو دوسروں کی طرح معقول زندگی گزارنے کے مواقع دئے جائیں تو نہ ملٹری کارروائی کی ضرورت پڑے گی اور نہ جوابی تشدد کی۔

سماج کے ذہن میں فرقہ وارانہ ذہنیت کس طرح جنم لیتی ہے آیئے اس پر بھی غور وخوض کریں۔ مجبوراً پھر امریکہ کی طرف لوٹنا پڑ رہا ہے۔ چار صدی قبل یوروپ کے لوگ امریکہ پہنچے اور اپنی سہولت کے لیے افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کو غلامی میں جکڑ کر وہاں لے گئے، ان پر ظلم کیے، جانوروں کی طرح ان سے اپنا کام لیا، بہر حال وہ سیاہ فام بھی امریکی باشندے بن گئے، لیکن سفید فام لوگ اپنے ذہنوں کو سفید نہ کر پائے اور نتیجتاً سیاہ فام لوگوں کے خلاف اکیسویں صدی میں بھی تعصب اتنا ہے کہ براک اوباما کو بھی کہنا پڑا کہ حکمرانی کا کوئی حصہ بھی اس تعصب سے پرے نہیں ہے۔ دستور ہند تو ملک کی حکومت کو ہر مذہب سے برابر کی دوری بنائے رکھنے کا ہے، اس کی پاسداری کرتے ہوئے اگر حکومت کے ذمہ دار خواتین و حضرات اپنی تقاریر میں اس بات کا خیال رکھیں تو ملک بھر میں پیغام جاتا رہے گا کہ مذہبی تعصب بہت خراب شئے ہے اور ایسا کرنا انسان دشمنی بھی ہے اور دیش دروہ بھی۔ اسکولی کتابوں میں تاریخ کو ذاتی یا گروپ کے سیاسی فائدے کے لیے توڑ مروڑ کے پیش نہ کیا جائے تو ملک کو پیغام چلا جائے گا کہ مذہبی تعصب سے بچنا چاہیے۔ اگر حکومت اور برسر اقتدار جماعت کے سینئر سیاسی لیڈروں کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اور ادائیگی کے اسٹائل میں خیال رکھا جائے کہ ہر مذہب کو برابر جگہ ملنی ہے اور سبھی مذاہب کی برابر عزت ہونی ہے تو ملک کو پیغام چلا جائے گا کہ مذہبی تعصب ہمارے قومی مزاج کے خلاف ہے۔ پھر فرقہ واریت کو ملک سے نکالنے کا نعرہ مؤثر ہو جائے گا۔ ان تمام اقدامات سے وزیراعظم کی ’من کی بات‘ زیادہ آسانی سے عوام کے ذہنوں میں اتر سکے گی۔ □❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 10 Aug-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

صلح حدیبیہ، اقلیتی کردار، الیکشن کمیشن و ناشائستہ ایئر مارشل

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”برطانیہ میں الیکشن کمیشن کا تعین پارلیمنٹ کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس کارروائی پر حکومت کا کنٹرول نہیں رہتا ہے۔ امریکہ میں یہ تعین صدر کرتا ہے لیکن سینیٹ کی منظوری کے بعد۔ہمارے ملک کو بھی اگر دنیا کے اعلیٰ جمہوری اقدار والے ملکوں کی صف اول میں جانا ہے تو الیکشن کمیشن کے تعین کے طریق کار میں شفافیت لانی ہو گی۔“

ایئرفورس کے ایئر مارشل انل چوپڑا جوفی الوقت ایئرفورس ٹریبونل کی لکھنؤ بینچ کے ممبر ہیں، انھوں نے گزشتہ اپریل میں ٹوئٹ کیا تھا کہ کشمیر میں پتھر پھینکنے والے 100 لوگوں کو گولی ماردی جائے، اس کے بعد جب فوج نے اپنی جیپ پر آگے ایک کشمیری نوجوان کو باندھا تو چوپڑا نے فوج کی اس 'تجدید کاری' کی تعریف کرتے ہوئے بھی ٹوئٹ کیا تھا۔ اس وقت دبے الفاظ میں کچھ لوگوں نے چوپڑا کی مذمت کی، لیکن ان دوعدد ٹوئٹ پر کوئی کہرام نہیں مچا۔ نتیجتاً چوپڑا اور ان کے ساتھ میں ہندوستانی سماج کے کئی لوگوں نے اپنے ذہنوں میں طے کرلیا کہ اس طرح کے ٹوئٹ کرنے میں کوئی زیادہ حرج نہیں ہے اور اس سے ہندوستانی سماج کے مجموعی اخلاقی معیار میں کوئی تنزلی نہیں ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں اُن ٹوئٹ کی وجہ سے اور ان کی زبردست عوامی مذمت اور چوپڑا کے خلاف ضروری قانونی کارروائی نہ ہونے کی وجہ سے اُس وقت سماج کی سوچ میں کئی ڈگری کی پستی آگئی تھی اور دنیا کے اخلاقی پیمانہ پر ہمارا ملک عزیز نیچے چلا گیا تھا۔ اب ہریانہ میں ایک نامور صوبائی سیاسی لیڈر کے لڑکے وِکاس برالا نے صوبہ کے ہی ایک سینئر آئی اے ایس افسر کی بیٹی ورنیکا کُندو کی گاڑی کو آدھی رات کے بعد شراب کے نشہ میں اپنی گاڑی سے سڑک پر دوڑا کر گھیرا اور وکاس کی اس حرکت پر چاروں طرف شور مچا۔ اس دوران انل چوپڑا نے گزشتہ اپریل میں اپنی ٹوئٹ پر پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی بگڑی ہوئی خصلت کے تئیں پھر ٹوئٹ کر کے خواتین پر حملوں سے متعلق الگ بینچ بنانے کے سپریم کورٹ کے فیصلے کا مذاق ہی نہیں اُڑایا، بلکہ اپنی ذہنی کدورت کی وجہ سے خواتین کے خلاف جرائم کرنے کی وکالت بھی کرڈالی۔

سپریم کورٹ کو اس معاملہ میں اپنے حق خود آگاہی (Power to take cognizance) سے کام لے کر ائیر مارشل انل چوپڑا کے خلاف سخت کارروائی کیے جانے کی ہدایت دینی چاہیے، اس طرح عدالت عظمیٰ کو چوپڑا کو آرٹیکل 51A(d) کے تحت اپنی دستوری ڈیوٹی پوری کرنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ مصلح افواج ٹریبونل قانون 2007 کے سیکشن 9 کے تحت اس ٹریبونل کا کوئی ممبر اگر ناشائستگی، بداطواری، بدسلوکی یا بدچلنی (Misbehaviour) میں ملوث پایا جاتا ہے تو صدر جمہوریہ کو اختیار ہے کہ وہ اسے عہدے سے برطرف کردیں، یہ تفتیش سپریم کورٹ کے جج کے ذریعہ کی جاتی ہے، اس کام کے لیے مرکزی حکومت کو سپریم کورٹ کے جج کی پوری مدد کرنی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ائیر مارشل انل چوپڑا کے خلاف تعزیرات ہند (Indian Penal Code) کے سیکشن 117 اور 509 کے تحت ایف آئی آر درج کی جانی چاہیے جس کے مطابق ان جرائم کے لیے تین برس تک کی قید بامشقت ہوسکتی ہے اور جرمانہ بھی لگ سکتا ہے۔ ضابطہ فوجداری (Criminal Procedure Code) کے سیکشن 66A کے تحت کمپیوٹر کے ذریعہ نازیبا، ناپسندیدہ، جارحانہ پیغام بھیجنے کے جرم میں پولیس کو چوپڑا کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی عدالت کو رسوا کرکے توہین عدالت (Contempt of Court by scandalizing) کے الزام میں بھی چوپڑا کے خلاف توہین عدالت قانون 1971 کے سیکشن 2(c)(i) اور سیکشن 12 کے تحت سزا سنائی جانی چاہیے، تبھی عالم ادراک میں ہمارے ملکی سماج کے کھوئے ہوئے وقار کی بحالی ممکن ہے۔

آنے والی عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے سلسلہ میں گورکھپور کے مسلمانوں نے آپس میں گفت وشنید کی اور ضلع مجسٹریٹ سے اس ایشو پر گفتگو کرنے کے لیے وقت لیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ قربانی کے لیے بھینسوں کی آمد، گوشت کے لانے لے جانے اور کھالوں کی سپردگی میں کوئی بیجا مداخلت نہ ہو اور گزشتہ برسوں کی طرح میونسپل بورڈ کی طرف سے صفائی ستھرائی کا مخصوص انتظام رہے۔ اسی طرز پر ملک کے دیگر اضلاع میں بھی مسلمانوں کو احتیاطی کارروائی کرلینی چاہیے۔ صدر کل ہند مجلس مشاورت کے وزیراعظم کے نام خط پر بھی بظاہر مثبت رد عمل ہوا ہے۔ ساتھ ہی ہم مسلمانوں کو اس دفعہ عید الاضحیٰ کے موقع پر زیادہ عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔ العفوَ اللہ کا نام ہے، اس کے لفظی معنی ہیں کشادہ دلی کے ساتھ اپنے حق سے دست برداری۔ اس وقت ہمیں صلح حدیبیہ یاد کرنے کی ضرورت ہے، جب نبی اکرمؐ نے عفو سے کام لیا اور وقتی طور پر پیچھے ہٹ گئے حالانکہ انھوں نے ہار نہیں مانی، لیکن ان کے ذہن میں مسلمانوں کے حق میں طویل مدت کے اثر والی حکمت عملی بھی تھی اور اللہ پر مکمل بھروسہ بھی۔ معاہدے کی ساری شرائط برابر نہیں تھیں، مثلاً اُس سال بغیر حج کیے مسلمانوں کو مدینہ لوٹ جانا تھا اور اگر مکہ کا کوئی آدمی مسلمانوں کے پاس پہنچے تو اسے مکہ واپس کرنا تھا، جبکہ اگر مسلمانوں کا کوئی شخص مکہ آجائے تو وہ واپس نہیں ہونا تھا۔ دونوں طرف سے ہتھیار نہیں اٹھائے جانے تھے اور اس کے عوض میں دس برس کے لیے امن کی گارنٹی تھی۔ اس درمیان قریش سے ملحق قبیلہ بنوبکر نے مسلم قبیلہ بنوخزاعہ پر حملہ کردیا تھا، لہٰذا قریش کی طرف سے انحراف کی وجہ سے معاہدہ تو ٹوٹ چکا تھا، غالباً یہ بھی غیبی امداد تھی، باقی تفصیل تو ہم سب کو معلوم ہی ہے۔ یہ نہیں کہا جارہا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے حالات میں شق در شق صلح حدیبیہ کا نفاذ ممکن ہے، لیکن ہاں اس متبرک معاہدہ کے پیچھے حکمت عملی کو ہمیں ضرور اختیار کرنا چاہیے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق موجودہ مرکزی حکومت کے رویہ کی طرز پر اب حکومت نے جامعہ ملیہ اسلامیہ پر بھی وہی رویہ اپنانے کی منشا ظاہر کی ہے۔ میں نے گزشتہ ہفتہ کے مضمون میں عرض کیا تھا کہ من کی بات میں وزیراعظم نے اگست 1942 کے 'بھارت چھوڑو نعرے' کی یاد میں کچھ برائیوں کو ہندوستان سے نکال دینے کا نعرہ دیا ہے، جس میں فرقہ واریت بھی شامل ہے۔ مسلمانوں کی گنی چنی چند یونیورسٹیاں ہیں اور پوری تاریخ کھلی کتاب کی طرح قلم بند ہے کہ ہر اعتبار سے یہ مسلمانوں کے ہی ادارے ہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ کیونکہ پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعہ انھیں یونیورسٹیوں کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے، جس سے ان کا اقلیتی کردار ختم ہو جاتا ہے تو اس عذر کو مسلمانوں کے ساتھ دستور شکن تعصب کی پالیسی کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے یہ رویہ وزیراعظم کی من کی بات میں دیے گئے نعرے کی جڑ کھود رہا ہے۔ امید ہے کہ اپنی یوم آزادی پر لال قلعہ کی تقریر سے وزیراعظم اس صریح تضاد کی وضاحت کریں گے۔

لوک سبھا میں ایک سوال کے جواب میں وزیر قانون نے کہا کہ الیکشن کمشنروں کے تعین کے لیے کولیجیم سسٹم شروع کرنے کی غرض سے قانون سازی کا حکومت کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یاد کیجیے کہ انتخابی اصلاحات پر مارچ 2015 کی اپنی رپورٹ میں لاء کمیشن نے سفارش کی تھی کہ تمام مرکزی الیکشن کمشنروں کا تعین کرنے سے قبل صدر جمہوریہ کو چاہیے کہ وہ اس معاملہ میں ایک سہ رکنی کولیجیم سے مشورہ کرلیں جس میں وزیراعظم، حزب مخالف کے لیڈر اور ملک کے چیف جسٹس شامل ہوں۔ سابق چیف الیکشن کمشنر نسیم زیدی نے بھی اسی سسٹم کے حق میں رائے دی تھی۔ ایل کے اڈوانی نے 2012 میں اس وقت کے وزیراعظم منموہن سنگھ کو خط لکھ کر کولیجیم سسٹم شروع کرنے کی تجویز دی تھی، کیونکہ ان کے خیال میں صرف وزیراعظم کی سفارش پر ہی الیکشن کمشنروں کے تعین سے ہمارے جمہوری نظام پر عوام کو زیادہ اعتماد نہیں ہو پاتا ہے۔ چیف الیکشن کمشنر کو عہدے سے برطرف کرنے کا اختیار آج بھی بذریعہ مواخذہ (Impeachment) صرف پارلیمنٹ کو ہی ہے۔ چیف وجیلنس کمشنر کا تعین بھی حزب مخالف کے لیڈر کی رائے سے ہی ہوتا ہے۔ برطانیہ میں الیکشن کمیشن کا تعین پارلیمنٹ کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس کارروائی پر حکومت کا کنٹرول نہیں رہتا ہے۔ امریکہ میں یہ تعین صدر کرتا ہے لیکن سینیٹ کی منظوری کے بعد۔ ہمارے ملک کو بھی اگر دنیا کے اعلیٰ جمہوری اقدار والے ملکوں کی صف اول میں جانا ہے تو الیکشن کمیشن کے تعین کے طریق کار میں شفافیت لانی ہوگی۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آراان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 17 Aug-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

حامد انصاری کا انٹرویو' قومی کشمکش کا شاہکار

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

حامد انصاری، سابق نائب صدر جمہوریہ کے اپنے عہدے کی مدت کے آخری دن مشہور صحافی کرن تھاپر کو دئے گئے راجیہ سبھائی وی انٹرویو میں علامہ اقبال کے تصور خودی کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اقبال کے مطابق خودی کی اخلاقی تعریف ہے خودمختاری' خود احترامی' خوداعتمادی' خودنگہداری اور خود وثوقی کے ساتھ سچائی' عدل اور فرض شناسی کی پاسداری کرنا' اگر ایسا کرنے میں اپنی ذات کے لئے خطرہ دکھائی پڑ رہا ہو تب بھی۔ خودی کی روحانی تعریف کے مطابق یہ ضمیر کی وہ چمکدار روشنی ہے جو ذہن میں تشکیل تخیلات وتخلیقات کو جلا بخشتی ہے' یہ وہ خاموش قوت ہے جو عملی جامہ میں آنے کے لئے بیتاب رہتی ہے۔ اسی تصور خودی کا استعمال کر کے علامہ نے نصیحت کی:

ہزار چشمے تیرے سنگ راہ سے پھوٹیں
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

گزشتہ دو تین برس میں حامد انصاری نے ملک میں جو کچھ ہوتے ہوئے دیکھا ہے ان نظاروں کے پس منظر میں ان کا روحانی وجوداپنی خودی میں غوطہ زنی کرتا رہا اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ ان کے ضمیر کی سچائی' عدل اور فرض شناسی کی آواز نے ملک کی نائب صدارت سے سبکدوشی سے قبل ہی ان کی خاموش قوت کو عملی جامہ پہنا دیا۔ کرن تھاپر کے سوالوں کے اپنے نپے تلے الفاظ پر مبنی جوابات سے انھوں نے اپنی عبدیت کا حق ادا کر دیا اور 125 کروڑ کے ملک میں باایمان لوگوں کو مرہون منت کر دیا۔ آزاد ہندوستان میں اتنے اعلیٰ عہدے سے ضمیر کی اس قدر صاف گوئی اور خوش بیانی کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔ گئو رکشکوں کے ذریعہ کئے گئے حالیہ حملوں' جگہ جگہ بھیڑ کے ذریعہ پروگرام کے تحت ایک نادار شخص کا قتل' لو جہاد' گھر واپسی کی منظم کوشش جیسی دستور مخالف حرکتوں اور حکومت کے ذریعہ ان کی گرفت نہ ہونے کے لئے حامد انصاری نے کہا کہ اس سے اعلیٰ ہندوستانی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ (Breakdown) اور نفاذ قانون کے رکھوالوں کی نااہلی ظاہر ہوتی ہے اور ہندوستان کے کسی بھی شہری کی ہندوستانیت پر سوال کھڑے کرنا ذہن کو مضمحل کرتا ہے۔ ہم ایک جامع سماج ہیں جو صدیوں سے ایک ایسے گرد و پیش (Ambience) میں رہ رہے ہیں جہاں ایک دوسرے کو دل سے قبول کیا جاتا رہا ہے' اب اُس ماحول پر خطرہ منڈلانے لگا ہے۔

گزشتہ دو تین برس میں حامد انصاری نے ملک میں جو کچھ ہوتے ہوئے دیکھا ہے ان نظاروں کے پس منظر میں ان کا روحانی وجوداپنی خودی میں غوطہ زنی کرتا رہا اور نوبت به ایں جا رسید که ان کے ضمیر کی سچائی' عدل اور فرض شناسی کی آواز نے ملک کی نائب صدارت سے سبکدوشی سے قبل ھی ان کی خاموش قوت کو عملی جامه پهنا دیا۔

کرن تھاپر نے پوچھا کہ کیا آپ متفق ہیں کہ ہندوستان میں عدم رواداری (Intolerance) بڑھ رہی ہے نائب صدر نے کہا' جی ہاں میں نے اس بارے میں پہلے بھی اپنی بنگلور کی تقریر میں ذکر کیا ہے۔ یہ پوچھے جانے پر کہ کیا آپ نے اپنی تشویش کا اظہار وزیر اعظم سے کیا' حامد صاحب نے کہا کہ' جی ہاں لیکن وزیر اعظم اور نائب صدر کے درمیان ہونے والی گفتگو خصوصی استحقاق (Privileged conversation) کے دائرے میں ہی رہنی چاہئے۔ سوال، کیا آپ ان کے جواب سے مطمئن ہوئے، جواب، بھئی ہر تشویشناک ماجرے کی ہمیشہ کچھ نہ کچھ وضاحت اور صفائی دی جاتی ہے، لیکن یہ عقل پر منحصر ہے کہ وہ وضاحت کس حد تک منظوری کے لائق ہے، اس پر کرن تھاپر نے کہا کہ یہ جواب بڑا اہم ہے اور عقلمند لوگ یقیناً سمجھ جائیں گے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

کرن تھاپر نے یاد دلایا کہ گزشتہ چند مہینوں میں سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ ہر فلم دکھائے جانے سے قبل جن گن من گایا جائے' پھر مدراس ہائی کورٹ نے کہا کہ وندے ماترم کم از کم ہفتہ میں ایک دفعہ تامل ناڈو کے اسکولوں میں اور کم از کم مہینہ میں ایک دفعہ سرکاری دفتروں اور پرائیویٹ اداروں میں گایا جانا چاہئے۔ ان فیصلوں نے رائے عامہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے' کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ عدالتی تجاوز (Judicial overeach) ہے اور کیا یہ ضروری ہے کہ ہم سب قومی ترانہ اور قومی گیت کے تئیں ایسا مبالغہ آمیز اظہار اطاعت ووفاداری کریں اور کیا ہمارے جذبہ قومیت کی اس نمائش کی ضرورت ہے۔ حامد صاحب نے جواب دیا کہ عدالتیں بھی سماج کا ہی حصہ ہیں اور اکثر جو وہ کہتی ہیں اس میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے' میں اسے عوامی عدم تحفظ کے احساس سے تعبیر کرتا ہوں' اپنے قومی جذبہ کو صبح شام اجاگر کرنے کی یہ روش غیر ضروری ہے' یہ یقین کامل رکھنا کہ میں ایک ہندوستانی ہوں بس اتنا کافی ہے' یہ عموماً مان لیا جانا چاہئے کہ ہر ہندوستانی ملک کے لئے فرمانبردار ہے۔ کرن تھاپر نے یاد دلایا کہ نائب صدر نے چند روز قبل ہی بنگلور کی اپنی تقریر میں کہا تھا کہ قومی جذبہ کی وہ ماہیت (Version) جو ثقافتی ارتکاب (Cultural commitment) کو اپنی بنیاد بنا کے رکھتی ہے وہ عام طور پر قومی جذبہ کی سب سے زیادہ دقیانوس اور تنگ دل شکل سمجھی جاتی ہے' اس سے متعصب اور مغرور وطن پرستی (Intolerant and arrogant patriotism) کو فروغ ملتا ہے' انھوں نے پوچھا کہ کیا آپ آج کل جو کچھ ہو رہا ہے اس پر گفتگو کر رہے تھے یعنی آپ 2017 میں ملک کے موڈ پر بات کر رہے تھے آپ نے ایسا کہنے کی ضرورت کیوں محسوس کی' جواب ملا جی ہاں یقیناً' ہر ایک کا بولنے کا ایک انداز ہوتا ہے اور میں نے اپنے انداز سے گفتگو کی۔ سوال' آپ نے سوامی وویکانند کا حوالہ دیا کہ 'ہمیں دیگر مذاہب کو صرف برداشت ہی نہیں کرنا چاہئے بلکہ مثبت طور پر انھیں گلے بھی لگانا چاہئے کیونکہ ہر مذہب کی بنیاد حق ہے' کیا آپ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ کچھ مذاہب سے ملک میں دوری رکھی جا رہی ہے بلکہ ان کے ساتھ تعصب بھی ہو رہا ہے۔ جواب' میں سمجھتا ہوں کہ رواداری ایک نیک فضیلت ہے (Tolerance is a virtue) لیکن وہ ناکافی ہے' اس لئے ہمیں اگلے پائیدان پر جانا ہے' رواداری سے قبولیت ومنظوری کی طرف (From tolerance to acceptance) اور عام طور پر وہ قبولیت ہمارے ملک میں فی الحال عنقا ہے۔

کرن تھاپر نے کہا کہ حال کے برسوں میں بی جے پی کے اراکین' وزرا اور سنگھ پریوار کی معروف شخصیات کی طرف سے تبصرے آئے ہیں جن میں مسلمانوں کو خاص طور پر تختہ مشق بنایا گیا ہے' میں نام نہیں لوں گا لیکن ایک وزیر نے ذکر کیا ......زادوں اور رام زادوں کا' آر ایس ایس کے ایک سربراہ نے کہا کہ سبھی ہندوستانی ہندو ہیں اور اس کے فوراً بعد ایک سینئر وزیر نے لقمہ دیا کہ ہندو تو ہی ہندوستان کی پہچان ہے' پھر ایک شخص نے کہا جو بعد میں وزیر اعلیٰ بن گئے' کہ مسلمان ہوجانے والی ہر ایک ہندو لڑکی کے بدلے میں ایک سو مسلم لڑکیوں کو ہندو بناؤں گا' محترم نائب صدر آپ بھی مسلمان ہیں' سیاسی طاقت والے ان لوگوں کی زبان سے یہ سب سن کر آپ کو کیسا لگتا ہے۔ جواب' میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کہنے والا ہر شخص ناخواندہ ہے' متعصب ہے اور وہ اس بنیادی قومی ساخت سے ہم آہنگ نہیں ہے جس پر ہندوستان نے ہمیشہ ناز کیا ہے یعنی کہ ہمیں بہ لحاظ وفراخ دل سماج کا حصہ بن کے رہنا ہے۔ تھاپر نے کہا کہ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ان تبصروں کے نتیجہ میں ملک میں جو موڈ پیدا کیا گیا ہے اس کی وجہ سے مسلمان فکرمند ہیں اور وہ اپنے کو غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں' کیا یہ صحیح اندازہ ہے یا یہ مبالغہ ہے۔ جواب' جو کچھ میں ملک کی مختلف سمتوں سے سن رہا ہوں' میں نے یہی بنگلور میں بھی سنا اور ملک کے دیگر حصوں میں بھی سنا' شمالی ہندوستان میں ہر روز سنتا ہوں' ملک میں بیچینی و اضطراب کی کیفیت ہے' عدم تحفظ کا احساس وجود میں آ رہا ہے۔

حامد انصاری چاہتے تو ہزاروں لاکھوں افراد کی طرح خاموشی سے گوشہ نشینی اختیار کر لیتے اس فکر میں کہ شاید آگے ذاتی طور پر کچھ اور فائدہ ہو جائے لیکن انھوں نے حق کا راستہ چن کر مثال قائم کر دی کہ کس طرح انفرادی وجود مجازی اور اور ہستی قوم کو حقیقی بنایا جا سکتا ہے' اس طرح انھوں نے علامہ اقبال کے ذہنی انتشار کو آسودگی بخشی:

کی ترک تگ ودو قطرے نے تو آبروئے گوہر تو ملی
آوارگیِ فطرت بھی گئی اور کشمکش دریا بھی گئی

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

حامد انصاری کا انٹرویو' قومی کشمکش کا شاہکار .233

Hamid Ansari ka interview' qaumi kashmakash ka shahkaar

http://www.roznamasahara.com/Details.aspx?id=127050&boxid=154435335

17 Aug 2017

Published in 24 Aug-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

> ”2014 سے ہی انہیں لکھ رہا ہوں کہ ملت اسلامیہ ہند کے یہ 18 مسائل ہیں اور ان کا یہ حل ہے لیکن مجھے تو آج تک کوئی جواب ہی نہیں ملا ، لہٰذا سوچنے کی بات ہے کہ یہ دہرے پیمانے کیوں؟ جو پوری ملت کے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے تحقیق شدہ کارروائیوں پر توجہ دلا رہا ہے اس پر کوئی شنوائی نہیں۔“

اگر آپ ایک بڑا مضبوط امرود ہاتھ میں پکڑیں اور کسی وجہ سے چاقو نہ استعمال کرنا چاہیں لیکن پھر بھی آپ کی پوری منشا ہو اس امرود کو کھانے کی تو آپ مختلف زاویوں سے مختلف انداز میں اسے ہاتھ میں پکڑ کر جگہ جگہ سے اسے دبانے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی چٹکی میں اگر کوئی کونہ آ جائے تو کوشاں رہتے ہیں کہ یہیں سے امرود میں شگاف پڑنے کی سبیل نکل آئے، بہرحال تھوڑے وقفہ کی تگ و دو کے بعد آپ اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ سنگھ پریوار نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہی امرود سمجھ رکھا ہے، حالاں کہ یہ امرود جاندار ہے لیکن وہ اپنے کو قاشوں اور بیجوں میں تقسیم کیے ہوئے ہے، یہی وجہ ہے کہ سنگھی ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے کے بیچ میں امرود کا کونہ کبھی آ بھی جاتا ہے جبکہ امرود کا درخت اگر یہ طے کر لے کہ میں سب کو اپنے پھل کے ذریعہ غذائیت وصحت بخشتا رہوں گا، لیکن اپنی انفرادیت اور انداز زندگی کو برقرار رکھوں گا تو اس کا یہی فیصلہ پروان چڑھتا رہے گا۔ انگوٹھے اور انگلی کی اسی طرح کی ایک کوشش ہے طلاق ثلاثہ کے ضمن میں بات کا بتنگڑ بنا دینا۔ سپریم کورٹ کے پاس جب کوئی مقدمہ آتا ہے تو وہ اس کا فیصلہ کرے گا ہی، لیکن وہاں تک معاملہ پہنچا کیوں اس کے لیے تو ہم ہی ذمہ دار ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ طلاق کے معاملہ میں سبھی افرادِ ملت بالکل پاک وشفاف ہیں، ہمارے یہاں رائی تو ہے ہی، تبھی تو اس کا پہاڑ بنا۔ لیکن ہم اکابرین ملت نے اپنی اندرونی چپقلش دور کرنے کے لیے برسوں سے کوئی مؤثر اقدامات نہیں کیے اور ہم شرعی مسائل طے کرنے کے لیے طریق اجماع پر صرف ہندوستانیوں کی چودھراہٹ سمجھ بیٹھے، گویا کہ اللہ نے اسلام نعوذ باللہ صرف ہندوستانیوں کے لیے ہی بنایا ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ اگلا اسی تاک میں ہے کہ ہماری کوئی کمزوری ذرا بھی دکھے تو اس پر ملک میں واویلا مچا دے، اس کے باوجود ہم شریعت کی تشریح وترجمانی میں اس طرح سے کام نہیں لیتے، جس طرح کا تقاضا ہوتا ہے، انھیں حالات کے لیے وسیم بریلوی نے کہا ہے:

تجھے قطرہ بھنانے کی پڑی ہے
ترے ہاتھوں سے دریا جا رہا ہے

طلاق ثلاثہ کے معاملہ میں ہم قطرہ بھنانے میں لگے رہے اور ہمارے ہاتھ سے دریا یوں چلا گیا کہ اب اگلے پائدان پر پہنچ کر یونیفارم سول کوڈ پر ٹی وی مباحثے تازہ دم ہو گئے۔ 21 اگست کو طلاق ثلاثہ پر سپریم کورٹ کا فیصلہ آیا، ٹی وی چینلوں پر بعد مغرب بحث کے لیے دعوتی فون آئے لیکن میں نے معذرت یوں کر لی کہ وہاں جا کے اس وقت کچھ کہنا مرہم پٹی کے بھی مترادف نہیں ہے جبکہ موقع تو ہے اندرون ملت خود احتسابی کا، ہاں اس رات ٹی وی پر اسدالدین اویسی نے سبرامنیم سوامی سے ٹھیک کہا کہ اگر مسلم خواتین کا اتنا ہی خیال ہے تو انھیں پارلیمنٹ اور اسمبلی ولوکل باڈیز میں، سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں ریزرویشن دے دو، جس پر سوامی نے وہی پرانا راگ الاپا کہ مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن غیر آئینی ہے، بغیر یہ بتائے ہوئے کہ پھر 1950 سے آج تک مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں اور عیسائیوں کو ریزرویشن سے خارج کیوں رکھا گیا ہے۔ ٹی وی پر سواتی چترویدی نے بھی صحیح کہا کہ اگر حقیقی جذبہ ہے مسلم خواتین کی مدد کرنے کا تو سچر کمیٹی کی سفارشوں کا حکومت نفاذ کیوں نہیں کرتی ہے۔ جو چند خواتین اس مسئلہ کو سپریم کورٹ لے گئیں ان سے مجھے یہ کہنا ہے کہ سماج میں ہر وہ شخص سب کی ہمدردی کا مستحق ہے جو مظلوم ہے اور ملت کی یہ غلطی ہے کہ اس نے ان کے اس اہم مسئلہ پر توجہ نہیں دی۔ یقیناً اکابرین ملت کو ایسا میکانزم ترتیب دینا چاہیے کہ اس طرح کے معاملات میں مظلومین کی امداد کی جائے، سپریم کورٹ میں اس کیس کے سبب پرسنل لاء بورڈ نے اس جانب کچھ پیش رفت کی بھی ہے۔

ہر مظلوم اپنا ہر معاملہ سپریم کورٹ لے کر نہیں جاتا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ اگر سپریم کورٹ نے کسی فعل پر پابندی لگا دی تو وہ فعل ملک میں کبھی نہیں ہوگا، یہ بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس فیصلہ کے آنے سے قبل بھی اس طرح کے جرائم سے نپٹنے کے لیے ملک میں قوانین موجود ہیں، ہاں سپریم کورٹ میں جانے سے یہ ہوا کہ پوری ملت کٹہرے میں کھڑی ہو گئی اور چند سیاستدانوں کے لیے لذت جلادی (Sadistic pleasure) کا ذریعہ بن گئی۔ لہٰذا جو مظلوم پڑھے لکھے اور سمجھدار ہیں، ان کو اپنے سپریم کورٹ جانے کے حق کے استعمال میں فرض کفایہ کا بھی دھیان رکھنا ہے کہ میرے اس حق کے استعمال سے کہیں سماج کا عظیم تر اور دیرپا حق تو نہیں مارا جا سکتا ہے۔ اُس شام ایسی ایک مظلوم خاتون بھی ٹی وی پر آئی تھیں اور انھوں نے کہا کہ میں پہلے بھی حکومت سے التجا کرتی رہی ہوں میری کبھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی، لیکن میں نے اپنی طلاق سے متعلق جب موجودہ حکومت کو لکھا تو دو دن میں ہی میری ملاقات حکومت کے ذمہ داروں سے ہو گئی۔ تو 'بی بی' میں تو 2014 سے ہی انھیں لکھ رہا ہوں کہ ملت اسلامیہ ہند کے یہ 18 مسائل ہیں اور ان کا یہ حل ہے لیکن مجھے تو آج تک کوئی جواب ہی نہیں ملا، لہٰذا سوچنے کی بات ہے کہ یہ دہرے پیمانے کیوں؟ جو پوری ملت کے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے تحقیق شدہ کارروائیوں پر توجہ دلا رہا ہے اس پر کوئی شنوائی نہیں اور ایک انفرادی جرم جس پر ذیلی عدالتیں فیصلہ کر سکتی تھیں، اس کو تابڑ توڑ قومی اہمیت کا موضوع بنا دینا اور اس کے لیے اتنا بڑا بیڑا اٹھا لینا کہ سپریم کورٹ میں حکومت کی طرف سے مؤثر وکالت کے ذریعہ پوری ملت کے پرسنل لاء میں آئندہ مداخلت کا جواز قائم کرنے کا دعویٰ کرنا، یہ بھی تو ان چند مظلوم خواتین کو سمجھنا چاہیے۔ ٹی وی پر مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے بھی صرف وہی افراد جائیں، جنھوں نے معاملہ کا خوب مطالعہ کر رکھا ہو اور اپنی بات کہنے کے لیے انھیں زبان پر دسترس بھی حاصل ہو، ورنہ اپنی نااہلی وعقل سلیم کے فقدان سے ملت کو مزید مجروح نہ کریں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بانیوں اور انتظام کاروں کو اللہ جزائے خیر عطا کرے کہ 1972 سے ملک میں اس کام کے لیے خلا کو انھوں نے پر کر رکھا ہے لیکن اپنے عزائم کی کامیابی کے لیے بہت سی دیگر کارروائی بھی ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو بورڈ کی ویب سائٹ ہی کہہ رہی ہے کہ 'اس کی تشکیل جاری ہے'، جس سے ملک میں صحیح پیغام نہیں جاتا ہے، دراصل ویب سائٹ کو زبردست طور پر متحرک رہنا چاہیے۔ اب زمانہ اکیلے چلنے کا نہیں ہے، بلکہ زمانہ کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہے، سماج میں آدھی آبادی خواتین کی ہے، ان کی متناسب نمائندگی بھی اہمیت رکھتی ہے، جو فیصلے لیے جائیں اس کا تفصیلی جواز ویب سائٹ پر ڈالنا چاہیے تاکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی تعلیم یافتہ آبادی اسے پڑھ کر اپنے کو مطمئن کر سکے۔ شرعی نکات پر اپنا نقطہ نظر قائم کرتے وقت ہمیں صرف اکیسویں صدی کے ابتدا والے ہندوستان کو ہی نہیں، بلکہ اس صدی کے اواخر اور اگلی صدیوں کے ہندوستانی مسلمانوں کو بھی دھیان میں رکھنا ہوگا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو کہ انھوں نے ایک صدی قبل ہی خلا کو پر کرنے کے لیے اپنے ذرائع کے مدنظر بہترین کام کیا اور بہشتی زیور تحریر کر کے شائع کر دیا، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ایک صدی بعد جب دنیا اتنی آگے بڑھ چکی ہے تو بھی وہی تحریر کافی ہو اور توسیع شدہ ضروریات ملت کی وہ مکمل پاسداری کرتی ہو۔ اسی سبق کی روشنی میں ہمیں پوری دنیا کے مسلمانوں کی طرح مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اپنی تفہیم دینی کو جلا بخشتے رہنا ہوگا، تبھی ہم اللہ کے پیغامبر کو پہنچانے کا حق ادا کر سکیں گے۔ مذہب اور سائنس کے مابین ہم آہنگیوں کے انکشاف کا سلسلہ متواتر چل رہا ہے، اس لیے بھی ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ دینی غور وفکر میں قطعیت خودکشی ہے، اس کے بجائے ملت کو فکر انسانی کی نشوونما پر باحتیاط نظر رکھنی ہوگی۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات ”تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ“ میں کہا: ہمیں ذہن نشیں کرنا ہوگا کہ دنیا صرف دیکھنے یا افکار وتصورات کی شکل میں سمجھنے کی شئے نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی چیز ہے جس کو ہم اپنے مسلسل عمل سے بار بار بناتے اور بنا کر پھر بناتے رہتے ہیں۔ یہ ہماری خودی کے لیے سرور کا لمحہ ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ انتہائی آزمائش کا بھی۔

❒❖❒

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 31 Aug-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

یکساں سول کوڈ، ایچ یو ایف اور رسمِ اُپنئین

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مذہبی کتابوں میں ایسا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہندو مذہب میں ایچ یو ایف کی کوئی ایسی کلیدی اہمیت ہے جیسی کہ ذات کی ہے، دیگر مذاہب میں تو پھر بھی وسیع تر خاندان کی اہمیت کے حوالے مذہبی کتاب میں ملتے ہیں۔“

دستور ہند کی دفعہ 44 کے مطابق پارلیمنٹ وحکومت کی کوشش رہنی چاہیے کہ ملکی باشندوں کے لیے ایک یونیفارم سول کوڈ مہیا کریں۔اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مختلف مذاہب کی آسمانی کتابوں اور رواجوں کی بنیاد پر جو پرسنل قوانین رائج ہیں، ان کی جگہ ایک یکساں سول کوڈ مرتب کر دیا جائے۔ اس کوڈ میں جو اہم نکتہ آنا چاہیے، وہ ہے اُپنئین کے رواج کو سبھی ہندوؤں کے لیے مہیا کرانا۔ یادرکھئے کہ اس رسم کو مہکھلا یا یجنیو پویتم بھی کہا جاتا ہے۔ ہندو مذہب میں یہ رسم کرنے کا حق صرف برہمنوں کو ہے۔ کچھ ہندو تنظیمیں کہتی ہیں کہ یہ حق کشتریہ اور ویش لوگوں کو بھی ہے۔ لیکن سب ہندو متفق ہیں کہ یہ حق دلتوں کو نہیں ہے، جبکہ 1950 کے صدارتی آرڈر کے مطابق شیڈولڈ کاسٹ وہی مانا جائے گا جو ہندو مذہب کو مانتا ہو۔ حالاں کہ بعد میں اس کی تعریف میں سکھ اور بودھ بھی جوڑ دیے گئے لیکن یہاں ہمارا سروکار صرف ہندو مذہب سے ہے۔ ایک طرف 1950 کے آرڈر میں شیڈولڈ کاسٹ کے لوگوں کو ہندو مانا جارہا ہے اور دوسری طرف شیڈولڈ کاسٹ کے لوگوں کے بچوں کو اُپنئین کے حق سے محروم رکھا جارہا ہے۔ دوم، اُپنئین صرف لڑکوں کے لیے ممکن ہے حالانکہ کشمیری پنڈتوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ لڑکیوں کے لیے بھی ہونا چاہیے، لیکن بیشتر ہندو پیشوا اس کو نہیں مانتے اور وہ بضد ہیں کہ یہ صرف لڑکوں کے لیے ہے۔ یقیناً یہ صنف نسواں کے ساتھ غیر دستوری ناانصافی ہے اور جدید عالمی سماج میں اس تعصب کے لیے جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا جب یونیفارم سول کوڈ بنے تو اس میں سب سے پہلا آئٹم یہی ہونا چاہیے کہ اُپنئین کی رسم کرنے کا حق ہر ہندو بچے کو ہوگا چاہے وہ کسی بھی ذات کا ہو۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو شیڈولڈ کاسٹ کے لوگوں کے ساتھ یہ مذہبی تعصب آزادی کے 70 برس کے بعد بھی چلتا رہے گا اور دستور ہند کا یہ رہنما اصول کہ ملک کے سبھی باشندوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنایا جائے، صرف خواب وخیال ہی رہ جائے گا۔

اب آیئے غور کرتے ہیں کہ یہ اُپنئین کا رواج ہے کیا اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ ہندو مذہب میں یہ مانا جاتا ہے کہ برہمن لڑکا عموماً جب 8 برس کا ہوجاتا ہے تو وہ اس رسم کے ذریعہ دوسرا جنم لیتا ہے اور اس کے بعد سے اسے دویجا (Twice born) کہا جاتا ہے۔اس کا حوالہ ہے برہم سوتر میں جو اُپنیشدوں میں دیے ہوئے فلسفیانہ و روحانی تصورات کے خلاصہ پر مبنی کتاب ہے۔ یہ رسم ہوجانے کے بعد برہمن لڑکے کو حق مل جاتا ہے مذہبی مقدس کتب بشمول ویدوں کو پڑھنے کا اور ساتھ ہی روحانی اور دیگر علوم حاصل کرنے کا، تبھی وہ منتروں کا جاپ کرسکتا ہے، اس رسم کے اختتام پر لڑکے کے جسم پر ایک مقدس دھاگا پہنایا جاتا ہے جس کو یجنوپویتم یا عرف عام میں جنیو کہتے ہیں۔ منواسمرتی میں لکھا ہے (II.36) کہ برہمن لڑکے کے لیے یہ رسم 8 برس کی عمر میں ہونی چاہیے، کشتریہ لڑکے کے لیے 11 برس کی عمر میں اور ویش لڑکے کے لیے 12 برس کی عمر میں۔ انسان کس گھرانے میں پیدا ہوا اس فیصلہ پر اس کا خود کوئی حق نہیں ہے تو اس کی پیدائش کیسے بنیاد بن سکتی ہے یہ طے کرنے کے لیے کہ کس عمر میں یہ رسم ادا کی جائے گی۔ یکساں سول کوڈ کے ذریعہ یہ تعصب بھی ختم کیے جانے کی ضرورت ہے۔ اُپنئین کی رسم کے دوران لڑکے کو گائتری منتر پڑھوایا جاتا ہے، جو تمام اُپدیشوں میں سب سے مقدم ہے اور اسی لیے اسے برہمو پدیسم کہا جاتا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد یہ سمجھا جاتا ہے کہ برہمن لڑکا چمکنے لگا اور وہ بے خوف ہوگیا۔ اس طرح برہمن لڑکے کو ذمہ داری دی جاتی ہے، عقل کے استعمال اور علم کے حصول کی اور والدین اور سماج کی خدمت کرنے کی۔ اس دھاگے کے پہننے سے برہمن لڑکے کو سماج میں ایک اعلیٰ مقام پر تفویض شدہ سمجھا جاتا ہے اور اب وہ سماج کی قیادت کرنے کا حق دار بن جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا برہمنوں کے علاوہ کسی کو بھی استعمال عقل اور حصول علم کا اور والدین وسماج کی خدمت کرنے کا حق نہیں ہے اور کیا تمام لڑکیوں کو بھی یہ حقوق نہیں ہیں اور کیا غیر برہمن اور خصوصاً شیڈولڈ کاسٹ کے لڑکوں اور سبھی ہندو ذاتوں کی لڑکیوں کو سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کا حق نہیں ہے، کیا برہمن لڑکوں کے علاوہ کسی کو بھی چمکنے، نڈر ہونے اور ہندو سماج کی قیادت کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس رسم کے دوران اُدا کا شانتی منتر پڑھے جاتے ہیں اور کلش میں رکھے پانی پر پھونک کر وہ پانی وہاں موجود لوگوں پر چھڑکا جاتا ہے اور اس طرح اس مقام کو اور ان لوگوں کو کثافت سے پاک کردیا جاتا ہے۔ جو گرو یہ رسم ادا کرواتے ہیں وہ لڑکے کو خدا سے جوڑتے ہیں اور اس کے بعد لڑکے کے بال منڈوا دیے جاتے ہیں اور سر پر صرف ایک چوٹی چھوڑ دی جاتی ہے۔ خدا سے جڑنے کا حق تو غیر برہمنوں کو بھی ہے اور سبھی لڑکے بال بھی منڈوا سکتے ہیں، حالانکہ لڑکیوں کو سماجی زندگی کے ہر شعبہ میں سر کے بال منڈوانے سے مستثنیٰ کر ہی دیا جاتا ہے تو پھر ان بیچاروں کو اُپنئین کا حق کیوں نہیں ہے۔ رسم ادا کروانے والے گرو کا خود برہمن ہونا ضروری ہے، یہ بھی تعصب ہے، ہندو کسی بھی ذات کا ہو چاہے شیڈولڈ کاسٹ کا ہی کیوں نہ ہو، ہر ایک گرو کو یہ رسم کروانے کا برابر کا حق ہونا چاہیے، جیسے نماز کی امامت کرنے کے لیے ایسی کوئی شرط ضروری نہیں ہے، لہٰذا نماز جماعت کی امامت کون کرے، اس میں اسلامی عدم تعصب کو یونیفارم سول کوڈ کے ذریعہ پورے ملک میں رائج کردیا جانا چاہیے۔ رسم کے بعد سے برہمن لڑکے کو دن میں تین دفعہ گائتری منتر پڑھنا ہوتا ہے اور اسے سندھیا وندنا کرنی ہوتی ہے جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے دل کو سکون ملتا ہے تو سکون قلب حاصل کرنے کا حق تو مع خواتین وشیڈولڈ کاسٹ کے سبھی کو ہے پھر ان کے ساتھ یہ زیادتی کیوں کہ وہ اُپنئین سے محروم رکھے جائیں۔ یکساں سول کوڈ کے ذریعہ رسم اُپنئین میں یہ تعصب ختم کیا جانا چاہیے۔

اسی طرز پر ہندو غیر منقسم خاندان یا ایچ یو ایف (Hindu Undivided Family: HUF) کا بھی معاملہ ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مذہبی کتابوں میں ایسا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہندو مذہب میں ایچ یو ایف کی کوئی ایسی کلیدی اہمیت ہے جیسی کہ ذات کی ہے، دیگر مذاہب میں تو پھر بھی وسیع تر خاندان کی اہمیت کے حوالے مذہبی کتاب میں ملتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں حکم ہے (4.1) کہ قرابت داروں کے باب میں تقویٰ اختیار کرو، بیشک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کو بڑی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے اور سلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ اسے ضرورتمند رشتہ داروں کا حق بتایا گیا ہے (2.177, 4.36, 17.26, 30.38)۔اس طرح کے مقدس حوالوں کے ذریعہ ہندو مذہب میں غیر منقسم خاندان کی اہمیت ثابت نہیں ہے، ہاں گزشتہ زمانہ میں اس کا رواج رہا ہے، جیسا کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے یہاں بھی رہا ہے۔ کوئی لائن قطعی نہیں کھینچی جاسکتی ہے کہ ہندو مذہب میں وسیع تر خاندان کو یکجا رکھنے کی ایسی اہمیت ہو، جیسی کہ فلاں فلاں مذہب میں نہیں ہے۔ پھر بھی ماضی کے قانون سازوں نے یہ فرض کرلیا کہ ہندوؤں میں غیر منقسم خاندان کی الگ اہمیت ہے۔ چلئے پھر بھی مان لیتے ہیں کہ یہاں تک ٹھیک ہے، لیکن اس پرسنل لاء کی بنیاد پر ایچ یو ایف کو انکم ٹیکس میں چھوٹ دینے کا تو بالکل جواز نہیں بنتا ہے۔ ایچ یو ایف کے ہر انفرادی رکن کو خود چھوٹ ملتی ہی ہے ساتھ ہی اگر وہ اپنی ایچ یو ایف بھی بنالے تو اسے کمپنیوں سے ملنے والے ڈویڈنڈ پر اور قلیل مدتی کیپیٹل گینس پر الگ سے چھوٹ ملتی ہے۔ ایچ یو ایف اپنا الگ بزنس بھی کرسکتا ہے، اسٹاک مارکیٹ میں رقم لگا سکتا ہے، وہ اپنے بیمار اراکین کے علاج کے لیے الگ سے چھوٹ لے سکتا ہے۔ ملک کا بازار ایچ یو ایف کے ذریعہ انکم ٹیکس بچانے کی ترکیبیں بتانے والی کتابوں سے اور انٹرنیٹ مضامین سے بھرا پڑا ہے۔ لہٰذا یکساں سول کوڈ میں تو اس سہولت کو فوراً ختم کیا جانا چاہیے تاکہ دستوری یکسانیت قائم کرکے آرٹیکل 44 کو اس کے انجام کار تک پہنچایا جاسکے۔

❐❖❐

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 14 Sep-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

روہنگیا مخالف ظلم و ستم کے اقتصادی و سیاسی پہلو

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

> ”2011 میں میانمار نے ملک میں اقتصادی و سیاسی اصلاحات نافذ کیں اور اپنے کو خارجی سرمایہ کاری کے لیے کھول دیا جس کی وجہ سے اسے ایشیا کی آخری سرحد (Asia's Final Frontier) کہا جانے لگا۔ اس کے فوراً بعد 2012سے ہی یکایک صوبہ رخائن میں روہنگیا و کاچن کے مسلمانوں کے خلاف ظلم و ستم کی وارداتوں میں اچانک کئی گنا اضافہ ہو گیا۔“

رخائن میانمار (برما) کا سب سے غریب صوبہ ہے۔ حال کے مہینوں اور برسوں میں سنگدل مظالم کرکے وہاں سے زبردستی بے گھر کیے گئے افراد کی دنیا کی تاریخ میں اب تک کی سب سے زیادہ موج زن تعداد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ماضی قریب میں مظلوم روہنگیا نے جوابی کارروائی کے لیے اراکان روہنگیا سالویشن آرمی بھی تشکیل کی ہے، خدا معلوم یہ خبر صحیح ہے یا کہ یہ بھی ایذا رسائی کرنے والوں کی کوئی چال ہے، تا کہ انھیں روہنگیا لوگوں کے خلاف مظالم کرتے رہنے کا جواز مل جائے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ان کو صرف مذہب یا نسل کی بنیاد پر دق کیا جارہا ہے، لیکن میانمار میں 135 نسلی گروہ ہیں، جن کی فہرست میں سے روہنگیا کو 1982 میں خارج کر دیا گیا تھا۔ میانمار کی معنوی لیڈر آنگ سان سوکی اب تک اپنے ملک میں روہنگیا کے خلاف منظم تشدد کی مذمت کرنے سے گریز کرتی رہی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے نوبل انعام برائے امن پر سوالات اٹھنے لگے ہیں۔ اس پس منظر میں ہمیں یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ روہنگیا پر ضرب کاری، ان کے عدم تحفظ اور بے دخلی کے پس پشت مذہبی اور نسلی دشمنی کے علاوہ کون سے عناصر کارگر ہیں۔ چلیے تحقیق کریں کہ کیا انسانیت کے خلاف ان گھناؤنے جرائم کی بنیاد سیاسی اور اقتصادی مفادات بھی ہیں۔ دراصل روہنگیا کے علاوہ اسی طرح کا تشدد میانمار کی دیگر اقلیتوں کے خلاف بھی ہورہا ہے، جیسے کاچن، شان، کارن، چن اور مان۔ حقیقت یہ ہے کہ میانمار میں زبردستی زمین پر ناجائز طور پر قابض ہو جانا اور دھوکہ دہی سے اس کی ملکیت اپنے نام کر لینے کا بازار گرم ہے، وہاں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی سے ہی برما کی ملٹری جنتا پورے ملک میں زمین کے چھوٹے زمیں داروں کی اراضی کو ان سے زبردستی چھینتی رہی ہے۔ اس کے لیے انھیں کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا جاتا رہا ہے اور اس کارروائی میں نسل یا مذہب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ اس طرح دستیاب کیے جانے والی زمین کے لیے عموماً یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اس کا مقصد ہے ملک کی ترقی و بالیدگی جس میں خصوصاً ملٹری اڈوں کی توسیع، زمین دوز معدنیات و دیگر قدرتی وسائل سے استفادہ، بڑے زراعتی پروجیکٹ وغیرہ شامل رہے ہیں۔ صوبہ کاچن میں ملٹری نے 500 ایکڑ زمین اپنے قبضہ میں لی تھی یہ کہہ کر کہ انھیں سونا نکالنے کے لیے کھدائی کرنی ہے۔ اس کے لیے ملٹری نے برما کے لوگوں کو سمندر کے ذریعہ بنگلہ دیش، تھائی لینڈ، ملیشیا، آسٹریلیا و ہندوستان بھاگنے پر مجبور کردیا۔ 2011 میں میانمار نے ملک میں اقتصادی و سیاسی اصلاحات نافذ کیں اور اپنے کو خارجی سرمایہ کاری کے لیے کھول دیا جس کی وجہ سے اسے ایشیا کی آخری سرحد (Asia's Final Frontier) کہا جانے لگا۔ اس کے فوراً بعد 2012 سے ہی یکایک صوبہ رخائن میں روہنگیا و کاچن کے مسلمانوں کے خلاف ظلم و ستم کی وارداتوں میں اچانک کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ ساتھ ہی حکومت نے نئے قانون بنادیے زمین کی تقسیم و انتظام کے لیے۔ اس طرح بڑی بڑی کمپنیوں کو زبردستی زمین پر ناجائز قبضہ کرنے کا تقریباً لائسنس مل گیا، میانمار کی اس حرکت کی چوطرفہ تنقید ہوئی، لیکن پھر بھی پاسکو دائیو (Posco Daevoo) اور دیگر کثیر قومی کمپنیاں (MNCs) میانمار کی مارکیٹ میں ہنسی خوشی شامل ہوگئیں۔

یہ ملک چین اور ہندوستان کے درمیان میں ہے اور دونوں ممالک کی متعدد حکومتیں عرصہ سے میانمار کے زیر زمین ذخائر پر نظر لگائے رہی ہیں۔ 1990 کی دہائی سے ہی چینی کمپنیاں میانمار کے شمالی صوبہ شان میں لکڑی، ندیاں اور معدنیات سے فائدہ اٹھاتی رہی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں میانمار کی ملٹری اور ہتھیاروں سے لیس گروہوں کے درمیان خوب جھڑپیں ہوتی رہی ہیں جن میں کاچن آزاد تنظیم (KIO) اور کاچن و شان صوبوں میں اس تنظیم کی نسلی اتحادی اکائیاں شامل رہی ہیں۔ میانمار کے صوبہ رخائن میں ہندوستان اور چین کے مفادات چین- ہند تعلقات کے وسیع نظارہ کا ہی ایک اہم جزو ہیں۔ یہ دونوں ملک اس خطہ میں انفرا اسٹرکچر (Infrastructure) اور پائپ لائن بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پورے میانمار کو ملازمتیں، ٹرانزٹ فیس اور تیل و گیس سے آمدنی ہو سکے گی۔ ستمبر 2013 سے ہی چینی قومی پٹرولیم کمپنی کے ذریعہ بنائی گئی بین الاقوامی پائپ لائن استعمال میں ہے جو صوبہ رخائن کے دارالسلطنت سِٹوے (Sittwe) کو چین میں مقیم شہر کُنمِنگ (Kunming) سے جوڑتی ہے۔ اس سے بھی بڑی پائپ لائن جس کے ذریعہ میانمار کی شوی گیس فیلڈ سے تیل اور گیس چین کے شہر گانگزو تک لے جایا جاسکے اس کے متعلق دستاویز تیار ہو چکے ہیں۔ ایک تیسری پائپ لائن جس کے ذریعہ صوبہ رخائن کے کیا کفو اسپیشل اکنامک زون سے مشرق وسطی کا تیل چین بھیجا سکے گا، کی تعمیر زیر غور ہے۔

میانمار کے سِٹوے بندرگاہ کی تعمیر میں ہندوستان نے میانمار کی مالی اور تکنیکی امداد کی ہے، اس کے ذریعہ ہندوستانی صوبہ میزورم کو خلیج بنگال سے جوڑا جاسکے گا۔ صوبہ رخائن کا ساحلی خطہ ہندوستان اور چین دونوں کی حکمت عملی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے، لہٰذا حکومت میانمار کا مفاد اس میں ہے کہ وہ وہاں کی زمین کو خالی کرائے تا کہ وہاں کی ترقی کی رفتار تیز ہو سکے۔ یہ ساری تگ و دو کی جارہی ہے اس خطہ کی جغرافیائی سیاست کے سیاق وسباق میں (In the context of geopolitics of the region)۔ لیکن اس کا خیال نہیں رکھا گیا ہے کہ اس پورے معاملہ میں انسانی جان اور عزت و آبرو کی بلی چڑھ رہی ہے۔ 1982 میں روہنگیا کی منظور شدہ قومی نسلوں کی فہرست سے نکال کے ان کے بنیادی شہری حقوق ختم کردیے گئے جس کے ذریعہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کی کوشش کر سکتے۔

1970 کی دہائی سے اب تک دس لاکھ سے زیادہ روہنگیا میانمار سے ہجرت کر چکے ہیں، لیکن جہاں وہ جا کر بسے ہیں، وہاں بھی ان کی کوئی پذیرائی نہیں ہو رہی ہے۔ کوئی ملک انھیں لینے کو تیار نہیں ہے، اس لیے وہ بیچارے مستقل ملک بدر ہوتے رہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ میانمار اور اس کے پڑوسیوں بشمول عرب ممالک کی سیاسی و اقتصادی خودغرضی کو سمجھا جائے اور بین الاقوامی عوام اس کے خلاف آوازیں اٹھائیں۔ برطانوی یونیورسٹی آف نیوکاسل کے تحقیق کار جوسیپے فورینو و ان کے رفقا نے اس سمت میں گہرائی سے کام کیا ہے جو قابل تحسین ہے۔ عالمی ملت اسلامیہ کا فرض بنتا ہے کہ دامے درمے قدمے سخنے مستقل کوشش کر کے متعلقہ حکومتوں پر زور دیں اور ان کو راضی کریں کہ روہنگیا مسلمانوں پر ظلم و زیادتی بند ہو، میانمار میں ان کی کلی شہریت بحال کی جائے، ان کی کھوئی ہوئی زمین جائداد انھیں واپس کی جائے۔ اقوام متحدہ اور بین الاقوامی حقوق انسانی کمیشن میں بھی درخواست لگائی جانی چاہیے۔ عالمی عدالت آئی سی جے (International Court of Justice) میں بھی میانمار کے خلاف مقدمہ قائم کیا جائے۔ مسلم ممالک کی ذمہ داری اور زیادہ بنتی ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے ذریعہ اس سلسلہ میں فوراً ایک مخصوص اجلاس بلایا جائے اور اقوام متحدہ کے توسط سے میانمار کی حکومت کو سرنگوں کیا جائے۔ حکومت ہند کی وزارت خارجہ کو ہر روز ہزاروں خطوط پہنچنے چاہئیں۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 21 Sep-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

روہنگیا پناہ گزیں: ہمارا ضمیر، سیاست اور عالمی سوچ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

جون 2012 کی سخت گرم دھوپ میں کھڑے رہ کر گھنٹوں ہمارے ڈاکٹر نجم السلام جلالی مدن پور کھادر دہلی میں زیڈ ایف آئی کے پلاٹ پر بے گھر روہنگیا پناہ گزینوں کو پناہ مہیا کرنے میں مصروف رہتے تھے، اس کے چند روز بعد ہی اللہ نے خوش ہوکر کم عمری میں ہی انھیں واپس بلا لیا، اللہ جنت میں ان کے درجات بلند کرے، آمین۔ یہی تقاضا ہے اللہ کی اطاعت کا جب وہ سورہ حشر میں فرماتے ہیں(59.9) کہ اپنے سے زیادہ مہاجرین سے محبت کرو۔ ستمبر 2016 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے نیو یارک اعلامیہ برائے رفیوجیز و امگرینٹس (New York Declaration for Refugees & Immigrants 2016) میں اقوام متحدہ کے سبھی 193 ممبر ممالک نے انسانیت عالم سے تحریری وعدہ کیا ہے کہ وہ دربدر ہوئے لوگوں کی بازآبادکاری کے لیے کشادہ قلبی اور محبت و اخوت کا رویہ اختیار کریں گے اور اس کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق زمین اور مالی وطبی امداد مہیا کریں گے، اس کے نفاذ کے لیے جامع پناہ گزیں ردعمل کی بنیادی ساخت (Comprehensive Refugee Response Framework: CRRF) کی تشکیل کی گئی ہے۔ اس کے مطابق، یہ طے کرنے میں کہ پناہ گزینوں کے کس گروہ کے ساتھ کیا رخ اختیار کرنا ہے، ان کے مذہب کو بنیاد نہیں بنایا جائے گا۔ اس اعلامیہ کو تیار کرنے اور اسے جاری کرنے میں حکومت ہند کے نمائندے کے طور پر امور خارجہ کے وزیر مملکت جنرل وی کے سنگھ موجود و متحرک تھے۔

لیکن جب یہ ملکی قانون بنایا جائے کہ ملک کے باہر سے آنے والے ہندوؤں کو حکومت ترجیح دے گی اور عدلیہ میں سرکاری حلف نامہ یہ داخل ہو کہ روہنگیا مسلمانوں کی برسوں سے چلی آ رہی پناہ ختم کر کے انھیں واپس میانماری درندوں کے منھ میں ڈھکیل دیا جائے گا تو نیو یارک ڈکلیئریشن کی کیسی اندیکھی ہورہی ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے اور اس کے لیے بنیاد بنایا جائے اس خدشہ کو کہ یہ لوگ مستقبل میں دہشت گردی میں شاید ملوث ہو سکتے ہیں۔ یہ سوچ انسانی وبین الاقوامی معقولیت کے پیمانے پر کتنی صحیح اترتی ہے اس پر بھی غوروخوض کرنے کی ضرورت ہے، جبکہ سابق وزیراعظم کو قتل کرنے والوں کی تنظیم سے جڑے ہوئے دسیوں ہزار پناہ گزینوں کی سری لنکا سے ہند آمد پر ہم پیار بھرا ہاتھ پھیلائے آج بھی کھڑے ہیں۔ پھر بھی انسان کا ضمیر تو اللہ نے بنایا ہے لہٰذا سیاسی شور روہنگیا مخالف ہونے کے باوجود وزیرخارجہ سشما سوراج نے ہوائی جہاز بھر کے زندگی کی ضروری اشیا تو انھیں بنگلہ دیش پہنچا ہی دیں اور وزیر مملکت برائے داخلہ کرن رجیجو نے کہا ہے کہ روہنگیا پناہ گزینوں کے ساتھ زورزبردستی نہیں ہوگی۔ خوش آئند ہے کہ جموں میں جو صاحب روہنگیا کیمپوں میں امداد فراہم کروا رہے ہیں، انھوں نے بتایا کہ وہاں سرکاری اسکیم آئی سی ڈی ایس اور اندردھنش کا استفادہ روہنگیا پناہ گزینوں کو مل رہا ہے، جس سے ان کے بچوں کو ٹیکے لگوانے اور دیگر اطفالی ضروریات کا انتظام کیا جارہا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ پناہ گزینوں کو طویل مدتی ہندوستانی ویزا ملا ہوا ہے، یو این ایچ سی آر(UNHCR) کے شناختی کارڈ تو ہیں ہی ان کے پاس۔ یو این ایچ سی آر نے حکومت ہند سے اپیل بھی کی ہے کہ روہنگیا لوگوں کو واپس نہ بھیجا جائے۔

”یوگینڈا پناہ گزینوں کو زمین بھی الاٹ کررہا ہے۔ عالمی بینک (World Bank) نے دنیا کے تمام پناہ گزینوں کی دیکھ ریکھ و امداد کے لیے دو بلین امریکی ڈالر کی گرانٹ دی ہے، یہ رقم ان ممالک میں تقسیم کی جائے گی جو خود غریب ہیں پھر بھی اپنے یہاں پناہ گزینوں کو رکھے ہوئے ہیں، تاکہ وہاں ضروری انفرااسٹرکچر بنایا جاسکے۔“

دوسری جانب نیو یارک ڈکلیئریشن کے CRRF کی روشنی میں متعدد ممالک میں نئے قانون بن گئے جن کے ذریعہ وہاں کی حکومتوں کے ذریعہ پناہ گزینوں کو سرکاری شناختی کارڈ جاری کیے جا رہے ہیں، ان کی رہائش کے لیے جگہ متعین کرانے کا انتظام ہورہا ہے، ان کو تعلیمی اداروں میں داخلہ مل سکے گا، اسپتالوں میں ان کا علاج ہو سکے گا، انھیں روزگار کا حق ملے گا، ان کے نوزائیدہ بچوں کو برتھ سرٹیفکیٹ ملے گا، عدالت سے ان کے حقوق کی پاسداری ممکن ہوگی اور سب سے بڑھ کے مختلف ممالک میں انھیں نیچرلائزیشن (Naturalization) کے ذریعہ اپنا ملکی باشندہ بنایا جا سکے گا اور اس طرح پناہ گزیں جس ملک میں رہ رہے ہیں وہاں کی اقتصادیات کو اونچا اٹھانے میں بھی یہ لوگ معاون ہوسکیں گے۔ یوگینڈا پناہ گزینوں کو زمین بھی الاٹ کررہا ہے۔ عالمی بینک (World Bank) نے دنیا کے تمام پناہ گزینوں کی دیکھ ریکھ وامداد کے لیے دو بلین امریکی ڈالر کی گرانٹ دی ہے، یہ رقم ان ممالک میں تقسیم کی جائے گی جو خود غریب ہیں پھر بھی اپنے یہاں پناہ گزینوں کو رکھے ہوئے ہیں، تاکہ وہاں ضروری انفرااسٹرکچر بنایا جاسکے۔ یوروپ کی تنظیم برائے بین الاقوامی باہمی تعاون (European Intern'l Dev Coop: DEVCO) اور جاپان کی بین الاقوامی تعاون ایجنسی (Japan Int'l Coop Agency: JICA) ان ممالک کی امداد کررہی ہے جو پناہ گزینوں کی میزبانی کررہے ہیں، تاکہ وہ سالانہ ایکشن پلان کے تحت انھیں ملکی ترقیاتی کاموں سے جوڑ سکیں۔ ملک ہندوراس (Honduras) میں آئندہ 26-27 اکتوبر کو علاقائی بین الاقوامی میٹنگ میں رفیوجی پروگرام CRRF کو باقاعدہ وسیع طور پر اپنایا جائے گا۔

گزشتہ 19 ستمبر کی شام ٹی وی پر پنج رخے مباحثہ میں بی جے پی کے نمائندے نے کہا کہ مسلم ممالک روہنگیا پناہ گزینوں کی میزبانی اور امداد کیوں نہیں کرتے۔ اس پر میں نے انھیں ٹوکا کہ بحث کے لیے بنیادی اعداد وشمار اور حقائق کا صحیح علم ہونا ضروری ہے۔ میں نے بتایا کہ بنگلہ دیش میں پونے 8 لاکھ روہنگیا پناہ گزیں ہیں، ان کی وزیراعظم نے کل ہی نیویارک میں کہا ہے کہ ان کا ملک امیر نہیں ہے لیکن جو کھانا بنگلہ دیش کے 16 کروڑ باشندے کھارہے ہیں، اسی کو 7-8 لاکھ مزید افراد میں بھی مل کے کھالیا جائے گا اور یہ کام شروع بھی ہوچکا ہے۔ پاکستان میں ساڑھے تین لاکھ روہنگیا ہیں، سعودی عرب میں دو لاکھ، ملیشیا میں ڈیڑھ لاکھ اور متحدہ عرب امارات میں 10 ہزار، جس نے دو ہوائی جہاز بھر کے ضروری اشیا UNHCR کے ذریعہ بنگلہ دیش بھی پہنچائی ہیں، مزید پروازوں کی تیاری ہورہی ہے، 25 ہزار سے زائد پناہ گزینوں کے لیے بنیادی سہولتیں پہنچائی جا چکی ہیں۔ بنگلہ دیش کے کوکس بازار میں شہریوں نے اپنے گھروں کے دروازے پناہ گزینوں کے لیے کھول دیے ہیں۔ اگر حکومت ہند کی خفیہ ایجنسیوں کو خطرہ ہے کہ ہمارے ملک میں مقیم سارے ہی روہنگیا مستقبل میں دہشت گردی میں ملوث ہو سکتے ہیں تو پھر جن ممالک میں لاکھوں روہنگیا مقیم ہیں، ان حکومتوں سے بھی حکومت ہند کو فوراً رجوع کر کے ان سے بھی ضروری معلومات حاصل کرنی چاہیے کہ وہاں کی خفیہ ایجنسیوں کی کیا رپورٹیں ہیں، تاکہ ایک متحدہ لائحہ عمل تیار کیا جاسکے اور پھر اگر لگتا ہے کہ ہند میں مقیم روہنگیا لوگوں جن کی کل تعداد پوری دنیا میں پھیلے روہنگیا پناہ گزینوں کے مقابلہ میں 3 فیصد سے بھی کم ہے، تو چلو پھر بھی اپنے قومی مفاد میں ان بیچاروں کو نکال دیا جائے لیکن کہاں بھیجیں گے ہم انھیں، کیا میانمار حکومت نے کہہ دیا کہ وہ انھیں واپس لے لیں گے اور اگر لے بھی لیا تو وہ ان کے ساتھ کیا وہی برتاؤ نہیں کریں گے جس کا الزام اقوام متحدہ نے میانمار حکومت پر لگایا ہے۔ قومی حقوق انسانی کمیشن کی کی بھی سننی چاہیے جس نے وزارت داخلہ کو اس معاملہ میں نوٹس دے رکھا ہے۔ ہاں پناہ گزینوں کو دستور ہند، ہمارے قوانین و قومی ثقافت کی پاسداری کرنی پڑے گی، اگر اس میں کہیں کوئی کمی دکھے تو متعلقہ فرد کے خلاف تمام ضروری قانونی کارروائی ضرور ہونی چاہیے۔ ❑❖❑

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 28 Sep-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

مسلم مخالف ماحول، دین کو ہم سے شکایت ہے

نظریہ .... **ڈاکٹر سید ظفر محمود**

"2017 کے ہندوستان میں جہاں اقلیت مخالف ہوا کو ہر روز زیادہ خراب کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی ہے، ہمارا یہ دستوری و دینی فرض ہے کہ ہم ملک بھر میں یکطرفہ کوشش کرتے رہیں کہ نفرتیں کم ہوں، اہل وطن ہمارے برتاؤ سے یہ جان لیں کہ مسلمان اچھے لوگ ہیں اور ان کے خلاف ماحول سیاسی نقطہ نظر سے ہی بنایا جا رہا ہے۔"

مکہ المکرّمہ میں مقیم، اقوام متحدہ سے الحاق شدہ، 55 سالہ پرانی بین الاقوامی تنظیم رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر محمد بن عبدالکریم العیسیٰ نے اپنے رفقا کے ہمراہ گزشتہ ہفتہ روم میں عیسائیوں کے عالمی سربراہ پوپ فرانسس سے ویٹکن جا کر ملاقات کے دوران باہمی عالمی جود، امن، ہم آہنگی و پیار محبت اور اس کی نشر و اشاعت اور فروغ کے لیے مشترکہ حکمت عملی پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر عیسیٰ نے پوپ کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اس دروغ گوئی کی پول کھولنے کے لیے کہ موجودہ دنیا میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کا تعلق مذہب اسلام سے ہے، دونوں مذہبی رہنماؤں نے ایک دوسرے کو تحائف بھی دیے۔ چند برس قبل نیو یارک میں ایک یونیورسٹی پروگرام کے بعد وہاں کی سربراہ پروفیسر نے مجھے اپنی ایک کتاب پیش کی جس کے مطابق دنیا میں حقوق انسانی کی فراہمی کے لیے پہلی کوشش تیرہویں صدی (1215AD) میں میکنا کارٹا (Magna Carta) کے ذریعہ ہوئی تھی۔ اس دستاویز کا مسودہ کینٹر بری کے آرک بشپ (Archbishop of Canterbury) نے تیار کیا تھا، جس کے ذریعہ چرچ کے حقوق بیان کیے گئے تھے اور انگلینڈ کے بادشاہ کنگ جان اور ان سے سخت اختلاف رکھنے والے جاگیرداروں (Barons) کے مابین امن کا معاہدہ کیا گیا تھا، اس دستاویز کو بعد میں پوپ نے مسترد کر دیا تھا جس کی وجہ سے اگلے دو برس تک بادشاہ اور جاگیرداروں کے درمیان لڑائی ہوتی رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی امریکی پروفیسر کو بتایا کہ دنیا میں حقوق انسانی کا پہلا دستاویز تو ساتویں صدی (632AD) کا ہے جب حضور اقدسؐ نے آخری خطبہ کے ذریعہ انسانی مساوات کا اصول بتایا تھا کہ سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے پیدا کرنے والے سے سب سے زیادہ ڈرے، بزرگی و فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے، ہر انسان کا خون، مال اور عزت ہر دوسرے انسان پر حرام کر دی گئی، ہر انسان دوسرے کی امانت واپس کرنے کا پابند بنا دیا گیا، اپنے ملازمین کو وہی کھلایا جائے اور پہنایا جائے جو خود کھایا جائے و پہنایا جائے۔ ربا کو حرام کر دیا گیا، شادی شدہ کے لیے حرام کاری کی سزا رجم ہے، قرض قابل ادائیگی ہے، تحفہ کا بدل دیا جانا چاہیے، عورتوں سے بہتر سلوک کیا جائے اور یہ احکامات آگے پہنچاتے رہنے کا حکم ہوا۔ نیو یارک میں کانفرنس کی میزبان پروفیسر بالکل تعجب میں رہ گئیں کیونکہ انھیں اس خطبہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اس روشنی میں بھی ہمیں ڈاکٹر عیسیٰ کی پوپ سے ملاقات پر غور کرنا چاہیے۔

آج کی دنیا میں دکھ درد کی جتنی وجہ خراب لوگوں کا تشدد ہے، اس سے زیادہ اس کی وجہ اچھے لوگوں کی خاموشی ہے۔ سماج میں پھیلے ہوئے منفی رجحان کو بے تاثیر کرنے کی مثبت کوشش کرنا بھی ہر اچھے انسان کا فریضہ ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم سمجھیں کہ قرآن کریم میں ہمیں دیگر مذاہب اور ان کے ماننے والوں سے برتاؤ کرنے کے لیے کیا ہدایات ملی ہوئی ہیں۔ سورہ بقرہ میں کہا گیا ہے کہ حضور اکرمؐ کے ماننے والوں، ان سے قبل یعنی یہودیوں، عیسائیوں اور سابعین میں سے وہ لوگ جو پروردگار اور یوم آخرت میں یقین رکھتے ہیں اور اچھے کام کرتے رہتے ہیں، انھیں نہ کبھی خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کو تینوں مذاہب کے لوگ مانتے ہیں۔ حضور اکرمؐ کے زمانہ میں مسلمانوں کی پہلی ہجرت ملک حبش کے عیسائی بادشاہ نجاشی کے پاس ہی ہوئی تھی، جس کے بارے میں ارشاد نبویؐ ہوا کہ وہ ملک دوستانہ ہے اور وہاں کا بادشاہ ناانصافی نہیں کرے گا۔ یہ بھی فرمایا کہ سارے لوگوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ قربت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے رکھتا ہوں اور سبھی پیغمبر ایک دوسرے کے بھائی ہیں (صحیح بخاری 4.55.651)۔ قرآن کریم کے مطابق مسلمانوں سے زیادہ محبت کرنے والے عیسائی لوگ ہیں (5.82)۔ قرآن کریم میں 600 سے زیادہ مرتبہ حضرت عیسیٰؑ یا عیسائیت کا ذکر ہے، ایک سورہ کا تو نام ہی مریم ہے۔ بائبل میں بھی پیغمبر آخرالزماں کی پیشین گوئی ہے (Deuteronomy 18.18, Genesis 49.10, Book of Isaiah 29.12)۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی خوب ذکر ہے۔ سورہ آل عمران میں ہمیں اہل کتاب کے تعلق سے ترغیب دی گئی ہے کہ جو کچھ ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، اس کی طرف آؤ (3.64)۔ دنیا کی تاریخ کا کوئی زمانہ اور کرہ ارض کا کوئی خطہ ایسا نہیں رہا، جہاں کے لیے پیغمبر مبعوث نہ کیا گیا ہو (5.48, 16.36, 35.24)۔ بہت سے پیغمبروں کو کتابیں بھی دی گئیں (13.38)۔ لیکن ان سب پیغمبروں اور سبھی کتابوں کے نام قرآن میں درج نہیں ہیں (40.78)، اس خدائی اسکیم کا بھی ذکر ہماری کتاب میں موجود ہے اور یہ کہ کتابیں پیغمبروں کی علاقائی زبان میں اتاری گئیں، وہ بات اور ہے کہ پہلے کے خدائی پیغاموں میں ردوبدل ہو گیا۔ ساتھ ہی سورہ بقرہ میں کہہ دیا گیا کہ رسولؐ و تمام مومن ایمان رکھتے ہیں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور ہم اللہ کے پیغمبروں کے مابین تفریق نہیں کرتے ہیں (2.285)۔ یہ بھی فرمایا کہ اللہ، اس کے رسولوں اور اس کی کتابوں پر اگر کوئی یقین نہیں رکھتا ہے تو وہ بہت ہی غلط راستہ پر ہے (4.136)۔

معلوم ہوا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اخوت و الفت بنائے رکھنے کا حکم قرآن کریم میں صریح طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے بین المذاہب ہم آہنگی کا وسیع ترین ذکر، دیگر مذہبی کتابوں کے مقابلہ میں، سب سے زیادہ قرآن کریم میں ہے۔ لیکن اللہ کے بہت سے دیگر پیغامات کی طرح اس پیغام کو بھی ہم اکابرین ملت و علمائے کرام عوام تک پہنچا نہیں سکے ہیں جس کے نتیجہ میں کافی حد تک عموماً اس بابت لوگوں میں منفی رجحان بنا ہوا ہے۔ چند روز قبل حیدرآباد کے ایک صاحب میرے دفتر ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے، دوران گفتگو میرے منھ سے بین المذاہب محبت (Interfaith affection) کے الفاظ ادا ہوتے ہی وہ بڑے ناراض ہو گئے اور پھر اس عنوان پر یکطرفہ منفی گفتگو کرتے رہے اور انداز کچھ یہ تھا کہ بین المذاہب ہم آہنگی کا تصور گویا دین اسلام کے خلاف ہے۔ ہمارے امام و خطیب صاحبان کو اس طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، تاکہ ملت کو قرآن کریم کا صحیح و مکمل پیغام پہنچتا رہے۔ بلکہ رابطہ عالم اسلام کے سکریٹری جنرل کی طرز پر چل کے تو ہمیں آگے بڑھ کے اس معاملہ میں پیش رفت کرنی چاہیے۔ جبکہ دستور ہند کی دفعہ 51A(c) کے مطابق بھی ہر ہندوستانی شہری کی ڈیوٹی ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان یکجہتی و آشتی کو فروغ دینے کے لیے ہمیشہ کوشش کرے۔ خصوصاً 2017 کے ہندوستان میں جہاں اقلیت مخالف ہوا کو ہر روز زیادہ خراب کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی ہے، ہمارا یہ دستوری و دینی فرض ہے کہ ہم ملک بھر میں یکطرفہ کوشش کرتے رہیں کہ نفرتیں کم ہوں، اہل وطن ہمارے برتاؤ سے یہ جان لیں کہ مسلمان اچھے لوگ ہیں اور ان کے خلاف ماحول سیاسی نقطہ نظر سے ہی بنایا جا رہا ہے۔ ہم اپنی یہ ڈیوٹی پوری نہیں کرتے ہیں، اس لیے ہمارے دین کو ہم سے شکایت ہے، بقول شاعر:

تم بتاتے تو ہمیں جانتی دنیا عرفاں
فائدہ عرض ہنر میں ہے، ہنر میں کیا ہے

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 05 Oct-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

اوقاف: ناجائز قبضہ بے دخلی بل سے کھلواڑ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

یوپی اے کے مرکزی دور حکومت کے اواخر یعنی 2014 کے شروع میں پارلیمنٹ میں وقف جائدادوں پر سے ناجائز قبضے ہٹانے کے لیے بل پیش کیا گیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اتنا وقت نہیں تھا کہ بل پاس بھی کروایا جاسکے۔ بعد ازاں یہ بل سلیکٹ کمیٹی کو سونپ دیا گیا تھا، جس نے اپنی رپورٹ پیش کردی ہے۔ اہم زاویہ یہ ہے کہ اس سلیکٹ کمیٹی میں لوک سبھا کے 20 اراکین میں سے صرف ایک مسلمان تھا اور راجیہ سبھا کے 10 اراکین میں سے صرف 3 مسلمان تھے اور کام کاج بڑھانے کے لیے ذمہ دار 4 افسران میں سے ایک بھی مسلمان نہیں تھا، جبکہ کمیٹی کے سامنے ایشو اوقاف سے متعلق تھا جو مذہب اسلام کا پرتو ہے اور دونوں ایوانوں اور ان کے سرکاری عملہ میں بھی اچھی خاصی تعداد میں مسلمان بلکہ ان میں سے بھی اوقاف کے کام کا تجربہ رکھنے والے افراد موجود ہیں۔ مسلمانوں کے تئیں اس رویہ سے سرکار کیا پیغام دینا چاہتی ہے، اس کو سمجھ لینا غالباً کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے، پھر بھی اپنے حقوق کو یقینی بنانے کیلئے مسلمان متحد نہ ہوں تو ملت کا اللہ ہی مالک ہے۔

2014 کے بل میں کہا گیا تھا کہ محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں اوقاف پر مجوزہ بل کا اطلاق نہیں ہوگا۔ ادھر کمیٹی کو معلوم ہوا کہ اس طرح کی جائدادوں میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے لیکن وہاں جانور پالے جارہے ہیں، جوا کھیلا جاتا ہے اور شراب نوشی بھی ہوتی ہے کیونکہ حکومت کی طرف سے ان تحویل شدہ وقف جائدادوں کی ضروری دیکھ بھال نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس طرح کی کچھ جائدادوں کے چاروں طرف لوگ رہنے بھی لگے ہیں۔ بظاہر ان ناگفتہ بہ حالات کے ازالہ کی غرض سے کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ جو آثار قدیمہ اس بل سے مستثنیٰ ہوں گے، ان میں مساجد شامل نہیں ہوں گی، لیکن یہ لکھتے وقت مساجد کے ساتھ "یا دیگر عبادت گاہیں" بھی جوڑ دیا گیا ہے۔ گویا حکومت کی تحویل میں جو اوقاف ہیں، وہاں کسی مذہب کے لوگ بھی اپنی عبادت گاہ اگر ناجائز طور پر بنالیں تو اس کو خالی کروانے کا اختیار مجوزہ بل کے تحت نہیں ہوگا۔ لہٰذا اشد ضروری ہے کہ "یا دیگر عبادت گاہیں" کے بجائے "یا دیگر مسلم عبادت گاہیں" جوڑا جائے۔ اسی طرح 2014 کے بل میں وقف بورڈ کے سی ای او کو اختیارات دیے گئے ہیں کہ وہ ناجائز قبضہ کو ہٹانے کے لیے ضروری فورس کی مدد لے سکتا ہے۔ سلیکٹ کمیٹی نے کہا ہے کہ بل میں ترمیم کرکے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ ناجائز قبضہ کو ہٹانے کے لیے سی ای او کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پولیس کمشنر یا سپرنٹنڈنٹ پولیس کے علاوہ ضلع کلکٹر کی بھی مدد لے۔ گویا جو اختیارات سی ای او کو دیے جارہے ہیں وہ انھیں استعمال نہیں کرپائے گا، بلکہ یہ اختیارات دراصل ضلع کلکٹر کو منتقل ہوجائیں گے۔ کمیٹی کے ذریعہ تجویز شدہ اس ترمیم کو مسترد کیا جانا بے انتہا اہم ہے۔ 2014 کے بل کے سیکشن 10 میں سی ای او کو بااختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص پر وقف جائداد کے کرایہ کی دینداری واجب ہے تو سی ای او آرڈر پاس کرکے اسے بقایہ کرایہ مقررہ تاریخ تک یا مقررہ قسطوں میں ادا کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ سیکشن 2(b) میں کرایہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ کرایہ کی رقم میں بجلی، پانی و دیگر خدمات کے وہ چارج بھی شامل ہوں گے جو کرایہ دار کے ذریعہ ادا نہ کیے جانے کی صورت میں متعلقہ وقف یا وقف بورڈ کو دینے پڑیں۔ اس پر سلیکٹ کمیٹی نے لکھا ہے کہ بل کے ذریعہ حکومت کرایہ کی رقم میں بجلی اور پانی کا خرچ بھی شامل کرنا چاہتی ہے، جس کا جواز نہیں دیا گیا ہے۔ اس نے لکھا کہ اس کے پاس اس تجویز کے خلاف خطوط آئے ہیں اور یہ کہ کمیٹی کی نظر میں کوئی ایسا قانون نہیں ہے، جہاں یہ اخراجات کرایہ کی رقم میں شامل ہوں کیونکہ یہ رقم تو ان ایجنسیوں کو ادا کی جاتی ہے جو یہ خدمات مہیا کرتی ہیں، جبکہ وقف بورڈ کو یہ رقم لینے کا حق نہیں ہے۔ لہٰذا کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ بجلی اور پانی کے اخراجات کرایہ کی رقم میں شامل نہیں کیے جانے چاہئیں۔ قارئین کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس معاملہ میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ نہیں لکھا کہ بل میں بجلی اور پانی کے صرف اُن اخراجات کو کرایہ کی رقم کا حصہ مانا گیا ہے جو اگر کرایہ دار ادا نہ کرے تو اس صورت میں یہ رقم متعلقہ وقف یا وقف بورڈ ادا کرنے کا قانونی طور پر ذمہ دار ہوگا۔ اگر اس خاص شرط کو زیر غور لایا جائے تو کمیٹی کے سامنے اس ایشو کا وجود ہی ختم ہوجاتا ہے اور اس کے ذریعہ کی گئی سفارش بے جارہ جاتی ہے۔

2014 کے بل کے سیکشن 2(1)(f) میں ناجائز قبضہ کی تعریف بیان کی گئی ہے یعنی کہ قبضہ بغیر قانونی اختیار کے ہو، یا اس اختیار کی مدت ختم ہوگئی ہو یا کسی اور وجہ سے وہ اجازت نامہ منسوخ کردیا گیا ہو۔ کمیٹی نے لکھا کہ اس کے سامنے دہلی کے اوقاف کے کرایہ داروں کی ویلفیئر ایسوسی ایشن نے لکھ کر اپنا مدعا پیش کیا کہ 2014 کے بل میں تجویز ہے کہ کرایہ دار کی وفات کے بعد اس کے قانونی نمائندہ کو جائداد پر ناجائز طور پر قابض مانا جائے جبکہ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ بل کے کس سیکشن میں یہ لکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بل میں 'ناجائز طور پر قابض' کی تعریف میں ترمیم کی جائے اور کرایہ دار کی وفات کے بعد جائداد پر جو بھی قابض ہو، اسے جائز مان لیا جائے۔ کمیٹی نے وزارت سے اس کی رائے پوچھی، وزارت نے بیحد معقول جواب دیتے ہوئے کہا کہ کرایہ داروں کے ذریعہ بے قاعدگیاں کی جارہی تھیں، لہٰذا 2013 میں پاس شدہ قانون کے تحت پرانے کرایہ داروں کا کیا ہونا ہے اس کا طریق کار طے ہوچکا ہے، اس کے لیے قانونی انکوائری ہوگی، پھر طے ہوگا کہ کون ناجائز طور پر قابض ہے اور کون جائز طور پر۔ فیصلہ کرنے سے پہلے سی ای او کے ذریعہ کرایہ دار کو نوٹس دیا جانا لازمی ہے اور اس کے جواب کو زیر غور لاکر تفصیلی آرڈر پاس کرنا ہوتا ہے۔ اگر سی ای او کے آرڈر سے کوئی مطمئن نہیں ہے تو وہ اپیل میں جاسکتا ہے۔ وزارت نے کہا کہ اس سلسلہ میں اب کوئی گفتگو کرنا بے سود ہے، کوئی کرایہ داری کبھی بھی دائمی یعنی ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی ہے اور نہ وہ موروثی ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیشہ ایک محدود وقفہ کے لیے ہوتی ہے، یہی معاملہ لیز کا بھی ہے۔ ایسا کوئی حق کہیں بھی نہیں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص لمبے عرصہ سے کرایہ دار ہے تو اس کی وفات کے بعد اس کے وارثوں کو کرایہ دار بنے رہنے دیا جائے۔ وزارت نے یہ بھی کہا کہ وقف جائدادوں کا مقصد کرایہ داروں کو سہولت پہنچانا نہیں ہے، بلکہ ان کا مقصد ہے مسلمانوں کی فلاح و بہبود۔ اگر موجودہ کرایہ دار موجودہ ریٹ پر کرایہ ادا کرتا ہے تو وہ کرایہ دار بنا رہ سکتا ہے جس کے لیے اسے پہلا حق دیا گیا ہے۔ وزارت کے ذریعہ کی گئی اس عالمانہ وضاحت کے باوجود سلیکٹ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ 2014 کے بل میں 'ناجائز طور پر قابض' کی تعریف میں ترمیم کرکے اس میں سے ان افراد کو نکال دیا جائے جو کرایہ دار کی وفات کے بعد اس وقف جائداد پر قابض ہیں۔

2014 کے بل کے سیکشن 1(5) میں گنجائش دی گئی ہے کہ بل کا نفاذ اس تاریخ سے ہوگا جو مرکزی حکومت گزٹ کے ذریعہ نوٹیفائی کرے گی اور یہ تاریخیں مختلف صوبوں میں یا صوبوں کے مختلف علاقوں کے لیے مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس پر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ کمیٹی کے سامنے تجویز آئی کہ اگر بل کا نفاذ ماضی کی تاریخ (With retrospective effect) سے نہیں کیا گیا تو بل کا مقصد فوت ہوجائے گا کیونکہ پھر اُس صورت حال میں ناجائز قبضے جو ماضی بعید سے برقرار ہیں، وہ اس بل کی زد سے باہر ہوجائیں گے۔ کمیٹی نے اپنے سامنے آئی ہوئی تجویز کو خارج کردیا، جبکہ سب کو خوب معلوم ہے کہ سپریم کورٹ کے متعدد فیصلے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ کسی نئے قانون کا ماضی کی تاریخ سے نفاذ مناسب نہیں ہے، حالانکہ کچھ حالات میں ماضی کی تاریخ سے نفاذ کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ لیکن جب سلیکٹ کمیٹی آگے کے سب دروازے ہی بند کردینا چاہتی ہے تو وقف جائدادوں کے واگزاری کی راہ میں کانٹے تو ابھی سے بچھائے جارہے ہیں۔

❐❖❐

"کوئی کرایہ داری کبھی بھی دائمی یعنی ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی ہے اور نہ وہ موروثی ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیشہ ایک محدود وقفہ کے لیے ہوتی ہے، یہی معاملہ لیز کا بھی ہے۔ ایسا کوئی حق کہیں بھی نہیں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص لمبے عرصہ سے کرایہ دار ہے تو اس کی وفات کے بعد اس کے وارثوں کو کرایہ دار بنے رہنے دیا جائے۔"

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 05 Oct-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

اوقاف: ناجائز قبضہ بے دخلی بل سے کھلواڑ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”کوئی کرایہ داری کبھی بھی دائمی یعنی ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی ہے اور نہ وہ موروثی ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیشہ ایک محدود وقفہ کے لیے ہوتی ہے، یہی معاملہ لیز کا بھی ہے۔ایسا کوئی حق کہیں بھی نہیں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص لمبے عرصہ سے کرایہ دار ہے تو اس کی وفات کے بعد اس کے وارثوں کو کرایہ دار بنے رہنے دیا جائے۔“

یوپی اے کے مرکزی دور حکومت کے اواخر یعنی 2014 کے شروع میں پارلیمنٹ میں وقف جائدادوں پر سے ناجائز قبضے ہٹانے کے لیے بل پیش کیا گیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اتنا وقت نہیں تھا کہ بل پاس بھی کروایا جاسکے۔ بعد ازاں یہ بل سلیکٹ کمیٹی کو سونپ دیا گیا تھا، جس نے اپنی رپورٹ پیش کردی ہے۔اہم زاویہ یہ ہے کہ اس سلیکٹ کمیٹی میں لوک سبھا کے 20 اراکین میں سے صرف ایک مسلمان تھا اور راجیہ سبھا کے 10 اراکین میں سے صرف 3 مسلمان تھے اور کام کاج بڑھانے کے لیے ذمہ دار 4 افسران میں سے ایک بھی مسلمان نہیں تھا، جبکہ کمیٹی کے سامنے ایشو اوقاف سے متعلق تھا جو مذہب اسلام کا پرتو ہے اور دونوں ایوانوں اور ان کے سرکاری عملہ میں بھی اچھی خاصی تعداد میں مسلمان بلکہ ان میں سے بھی اوقاف کے کام کا تجربہ رکھنے والے افراد موجود ہیں۔ مسلمانوں کے تئیں اس رویہ سے سرکار کیا پیغام دینا چاہتی ہے، اس کو سمجھ لینا غالباً کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے، پھر بھی اپنے حقوق کو یقینی بنانے کیلئے مسلمان متحد نہ ہوں تو ملت کا اللہ ہی مالک ہے۔

2014 کے بل میں کہا گیا تھا کہ محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں اوقاف پر مجوزہ بل کا اطلاق نہیں ہوگا۔ادھر کمیٹی کو معلوم ہوا کہ اس طرح کی جائدادوں میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے لیکن وہاں جانور پالے جارہے ہیں، جوا کھیلا جاتا ہے اور شراب نوشی بھی ہوتی ہے کیونکہ حکومت کی طرف سے ان تحویل شدہ وقف جائدادوں کی ضروری دیکھ بھال نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس طرح کی کچھ جائدادوں کے چاروں طرف لوگ رہنے بھی لگے ہیں۔بظاہر ان ناگفتہ بہ حالات کے ازالہ کی غرض سے کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ جو آثار قدیمہ اس بل سے مستثنیٰ ہوں گے، ان میں مساجد شامل نہیں ہوں گی، لیکن یہ لکھتے وقت مساجد کے ساتھ ”یا دیگر عبادت گاہیں“ بھی جوڑ دیا گیا ہے۔ گویا حکومت کی تحویل میں جو اوقاف ہیں، وہاں کسی مذہب کے لوگ بھی اپنی عبادت گاہ اگر ناجائز طور پر بنالیں تو اس کو خالی کروانے کا اختیار مجوزہ بل کے تحت نہیں ہوگا۔لہٰذا اشد ضروری ہے کہ ”یا دیگر عبادت گاہیں“ کے بجائے ”یا دیگر مسلم عبادت گاہیں“ جوڑا جائے۔ اسی طرح 2014 کے بل میں وقف بورڈ کے سی ای او کو اختیارات دیے گئے ہیں کہ وہ ناجائز قبضہ کو ہٹانے کے لیے ضروری فورس کی مدد لے سکتا ہے۔سلیکٹ کمیٹی نے کہا ہے کہ بل میں ترمیم کرکے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ ناجائز قبضہ کو ہٹانے کے لیے سی ای او کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پولیس کمشنر یا سپرنٹنڈنٹ پولیس کے علاوہ ضلع کلکٹر کی بھی مدد لے۔گویا جو اختیارات سی ای او کو دیے جارہے ہیں وہ انھیں استعمال نہیں کرپائے گا، بلکہ یہ اختیارات دراصل ضلع کلکٹر کو منتقل ہوجائیں گے۔کمیٹی کے ذریعہ تجویز شدہ اس ترمیم کو مسترد کیا جانا بے انتہا اہم ہے۔ 2014 کے بل کے سیکشن 10 میں سی ای او کو بااختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص پر وقف جائداد کے کرایہ کی دینداری واجب ہے تو سی ای او آرڈر پاس کرکے اسے بقایہ کرایہ مقررہ تاریخ تک یا مقررہ قسطوں میں ادا کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔سیکشن 2(b) میں کرایہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ کرایہ کی رقم میں بجلی، پانی و دیگر خدمات کے وہ چارج بھی شامل ہوں گے جو کرایہ دار کے ذریعہ ادا نہ کیے جانے کی صورت میں متعلقہ وقف یا وقف بورڈ کو دینے پڑیں۔اس پر سلیکٹ کمیٹی نے لکھا ہے کہ بل کے ذریعہ حکومت کرایہ کی رقم میں بجلی اور پانی کا خرچ بھی شامل کرنا چاہتی ہے، جس کا جواز نہیں دیا گیا ہے۔اس نے لکھا کہ اس کے پاس اس تجویز کے خلاف خطوط آئے ہیں اور یہ کہ کمیٹی کی نظر میں کوئی ایسا قانون نہیں ہے، جہاں یہ اخراجات کرایہ کی رقم میں شامل ہوں کیونکہ یہ رقم تو ان ایجنسیوں کو ادا کی جاتی ہے جو یہ خدمات مہیا کرتی ہیں، جبکہ وقف بورڈ کو یہ رقم لینے کا حق نہیں ہے۔لہٰذا کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ بجلی اور پانی کے اخراجات کرایہ کی رقم میں شامل نہیں کیے جانے چاہئیں۔قارئین کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس معاملہ میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ نہیں لکھا کہ بل میں بجلی اور پانی کے صرف اُن اخراجات کو کرایہ کی رقم کا حصہ مانا گیا ہے جو اگر کرایہ دار ادا نہ کرے تو اس صورت میں یہ رقم متعلقہ وقف یا وقف بورڈ ادا کرنے کا قانونی طور پر ذمہ دار ہوگا۔اگر اس خاص شرط کو زیر غور لایا جائے تو کمیٹی کے سامنے اس ایشو کا وجود ہی ختم ہوجاتا ہے اور اس کے ذریعہ کی گئی سفارش بے جارہ جاتی ہے۔

2014 کے بل کے سیکشن 2(1)(f) میں ناجائز قبضہ کی تعریف بیان کی گئی ہے یعنی کہ قبضہ بغیر قانونی اختیار کے ہو، یا اس اختیار کی مدت ختم ہوگئی ہو یا کسی اور وجہ سے وہ اجازت نامہ منسوخ کردیا گیا ہو۔ کمیٹی نے لکھا کہ اس کے سامنے دہلی کے اوقاف کے کرایہ داروں کی ویلفیئر ایسوسی ایشن نے لکھ کر اپنا مدعا پیش کیا کہ 2014 کے بل میں تجویز ہے کہ کرایہ دار کی وفات کے بعد اس کے قانونی نمائندہ کو جائداد پر ناجائز طور پر قابض مانا جائے جبکہ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ بل کے کس سیکشن میں یہ لکھا ہے۔انھوں نے کہا کہ بل میں 'ناجائز طور پر قابض' کی تعریف میں ترمیم کی جائے اور کرایہ دار کی وفات کے بعد جائداد پر جو بھی قابض ہو، اسے جائز مان لیا جائے۔ کمیٹی نے وزارت سے اس کی رائے پوچھی، وزارت نے بیحد معقول جواب دیتے ہوئے کہا کہ کرایہ داروں کے ذریعہ بے قاعدگیاں کی جارہی تھیں، لہٰذا 2013 میں پاس شدہ قانون کے تحت پرانے کرایہ داروں کا کیا ہونا ہے اس کا طریق کار طے ہوچکا ہے، اس کے لیے قانونی انکوائری ہوگی، پھر طے ہوگا کہ کون ناجائز طور پر قابض ہے اور کون جائز طور پر۔ فیصلہ کرنے سے پہلے سی ای او کے ذریعہ کرایہ دار کو نوٹس دیا جانا لازمی ہے اور اس کے جواب کو زیر غور لاکر تفصیلی آرڈر پاس کرنا ہوتا ہے۔اگر سی ای او کے آرڈر سے کوئی مطمئن نہیں ہے تو وہ اپیل میں جاسکتا ہے۔ وزارت نے کہا کہ اس سلسلہ میں اب کوئی گفتگو کرنا بے سود ہے، کوئی کرایہ داری کبھی بھی دائمی یعنی ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی ہے اور نہ وہ موروثی ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیشہ ایک محدود وقفہ کے لیے ہوتی ہے، یہی معاملہ لیز کا بھی ہے۔ایسا کوئی حق کہیں بھی نہیں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص لمبے عرصہ سے کرایہ دار ہے تو اس کی وفات کے بعد اس کے وارثوں کو کرایہ دار بنے رہنے دیا جائے۔وزارت نے یہ بھی کہا کہ وقف جائدادوں کا مقصد کرایہ داروں کو سہولت پہنچانا نہیں ہے، بلکہ ان کا مقصد ہے مسلمانوں کی فلاح و بہبود۔اگر موجودہ کرایہ دار موجودہ ریٹ پر کرایہ ادا کرتا ہے تو وہ کرایہ دار بنا رہ سکتا ہے جس کے لیے اسے پہلا حق دیا گیا ہے۔وزارت کے ذریعہ کی گئی اس عالمانہ وضاحت کے باوجود سلیکٹ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ 2014 کے بل میں 'ناجائز طور پر قابض' کی تعریف میں ترمیم کرکے اس میں سے ان افراد کو نکال دیا جائے جو کرایہ دار کی وفات کے بعد اس وقف جائداد پر قابض ہیں۔

2014 کے بل کے سیکشن 1(5) میں گنجائش دی گئی ہے کہ بل کا نفاذ اس تاریخ سے ہوگا جو مرکزی حکومت گزٹ کے ذریعہ نوٹیفائی کرے گی اور یہ تاریخیں مختلف صوبوں میں یا صوبوں کے مختلف علاقوں کے لیے مختلف ہوسکتی ہیں۔اس پر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ کمیٹی کے سامنے تجویز آئی کہ اگر بل کا نفاذ ماضی کی تاریخ (With retrospective effect) سے نہیں کیا گیا تو بل کا مقصد فوت ہوجائے گا کیونکہ پھر اُس صورت حال میں ناجائز قبضے جو ماضی بعید سے برقرار ہیں، وہ اس بل کی زد سے باہر ہوجائیں گے۔ کمیٹی نے اپنے سامنے آئی ہوئی تجویز کو خارج کردیا، جبکہ سب کو خوب معلوم ہے کہ سپریم کورٹ کے متعدد فیصلے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ کسی نئے قانون کا ماضی کی تاریخ سے نفاذ مناسب نہیں ہے، حالانکہ کچھ حالات میں ماضی کی تاریخ سے نفاذ کی اجازت بھی دی گئی ہے۔لیکن جب سلیکٹ کمیٹی آگے کے سب دروازے ہی بند کردینا چاہتی ہے تو وقف جائدادوں کے واگزاری کی راہ میں کانٹے تو ابھی سے بچھائے جارہے ہیں۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 26 Oct-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

قلب انسانی عشق خدا کا سرچشمہ بن سکتا ہے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

> **”قرآن پاک نے اپنے کو انسانی دل کے علاج کے لیے ماہر کا درجہ دیا ہے، جس کی مدد سے شک و شبہ، تاریکی، جہالت اور اندیشہ و تشویش کو دور کیا جاسکتا ہے۔ قرآنی پیغامات کے ذریعہ مایوسی، نازیبا تمنا اور بے اعتباری میں پھنسے ہوئے دلوں کو تسلی، تشفی اور ہمت افزائی کے ذریعہ صحت مند بنایا جاسکتا ہے۔“**

قلب انسانی کے عجائب کے بارے میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ انسان اپنی جس برتری کی وجہ سے خدا کی دیگر مخلوقات پر سبقت رکھتا ہے، وہ ہے پروردگار کے بارے میں اس کا محدود علم جبکہ اللہ اپنی مخلوق کے لیے عموماً ماورائے ادراک ہے۔ انسان کے اس علم محدود کے احاطے میں شامل ہیں خود اس کا حسن جمال، تکمیل وجود، شان وجلال اور اگلی دنیا میں اس کے لیے اہتمام بہم رسائی اور ذخیرہ۔ انسان یہ علوم صرف اپنے دل کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور اس عمل حصول میں اس کے جسم کے کسی اور حصہ کا کوئی کردار نہیں ہوتا ہے، کیونکہ یہ دل ہی ہے جو اللہ کو پہچان سکتا ہے، اس کے لیے کام کرتا ہے، اس کی خوشنودی کے لیے جد و جہد کرتا ہے، اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور صفات الٰہی کے انکشاف کا سرچشمہ بنتا ہے۔ اس کے برخلاف جسم انسانی کے تمام دیگر اعضا اس کے دل کے ہی پیروکار اور آلۂ کار بن کے رہتے ہیں، کیونکہ صرف دل ہی کو اللہ تعالیٰ شرف باریابی عطا کرتے ہیں، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ بجز اللہ کے باقی ہر شئے سے پاک وصاف ہو، جب دل غیر اللہ کے ساتھ منسلک ہوتا ہے تو اس کے اور اللہ کے درمیان پردہ پڑ جاتا ہے۔ اگر انسان اپنے قلب کو سمجھ لے تو وہ اپنے کو جان لیتا ہے اور جب وہ اپنے کو جان لیتا ہے تو وہ پروردگار کو جاننے کی طرف بڑھنے لگتا ہے، لہٰذا دل کی خصوصیات اور اس کے امتیازی اوصاف کا علم ہی دین کی جڑ اور ایمان کی بنیاد ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم میں قیامت کے دن کے لیے کہا گیا ہے(26.88-9) کہ اس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، ہاں جو انسان قلب سلیم لے کر آئے گا تو اور بات ہے۔ آیئے انسان کے جسم میں دل کی خصوصیات کو مزید سمجھنے کی کوشش کریں۔

ارشاد نبویؐ ہے کہ انسان کے اعمال میں اس کی نیت کا بڑا دخل ہوتا ہے اور اعمال کا صلہ اس نیت کے مطابق ہی ملے گا(مسلم 1907)۔ علما کا کہنا ہے کہ نیت کی رہائش گاہ دل میں ہوتی ہے، اگر دل کی نیت ثابت وسالم ہے تو ضمنی عمل اللہ کو پسند آئے گا، لیکن اگر نیت میں کدورت یا منافقت ہوگی تو اس سے متعلق عمل کو اللہ مسترد کردے گا۔ بندے کے اعمال کا امتحان اس کے دل میں ہی ہوتا ہے، ایک حدیث(مسلم 2564) کے مطابق اللہ تعالیٰ انسان کی شکل وصورت نہیں، بلکہ اس کی نیت اور اس کے اعمال دیکھتے ہیں۔ احکامات الٰہی کی تفہیم کا مرکز بھی دل ہی ہوتا ہے، باری تعالیٰ فرماتے ہیں:(47.24) مفہوم: کیا لوگ قرآن پاک پر غور نہیں کریں گے، کیا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟ حرص ولالچ سے دل کی شستگی وشفافیت اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت میں کمی آجاتی ہے۔ خلافت امویہ کے دور کے مشہور عالم سفیان بن سعید الثوری کہتے تھے کہ مجھے قرآن کریم سمجھنے کی استطاعت عطا ہوئی، لیکن جب میں نے سلطان کا تحفہ قبول کرلیا تو میں اس سے محروم ہوگیا۔ حضور اقدسؐ نے اپنے قلب مبارک کی طرف اشارہ کر کے تین بار کہا تھا کہ تقویٰ یہاں ہی ہوتا ہے(مسلم 2564)۔ جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ سب سے بہتر کون لوگ ہیں، فرمایا وہ جن کا دل صاف ہو اور زبان صادق ہو، لوگوں نے کہا کہ ہم سچی زبان سمجھتے ہیں لیکن صاف دل کسے کہتے ہیں، فرمایا جو خالص ہو اور گناہ، کینہ اور حسد سے پاک ہو(ابن ماجہ 4462)۔ آپؐ نے دعا کی کہ یا اللہ دین کے لیے ہمیں محبت عطا کیجیے اور اس کو خوبصورتی سے ہمارے دلوں میں سجا دیجیے(سنن 10370)۔ قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نصیحت اور دلوں کے روگ کی شفا آئی ہے اور ایمانداروں کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن پاک نے اپنے کو انسانی دل کے علاج کے لیے ماہر کا درجہ دیا ہے، جس کی مدد سے شک وشبہ، تاریکی، جہالت اور اندیشہ وتشویش کو دور کیا جاسکتا ہے۔ قرآنی پیغامات کے ذریعہ مایوسی، نازیبا تمنا اور بے اعتباری میں پھنسے ہوئے دلوں کو تسلی، تشفی اور ہمت افزائی کے ذریعہ صحت مند بنایا جاسکتا ہے۔ قرآن پاک یہ بھی بتاتا ہے (13.28) کہ اللہ کو یاد کرنے سے دلوں کو تسکین ملتی ہے، اس لیے دل کا یہ حق ہے کہ انسان اللہ کو یاد کرتا رہے۔ گناہوں اور دیگر غلط کاموں سے دلوں پر زنگ لگ جاتا ہے(83.14) جس کی وجہ سے ایسا دل صداقت کو پہچان نہیں پاتا ہے۔ اللہ نے ہمیں یہ دعا بھی سکھائی ہے کہ اے رب، جب آپ ہمیں سیدھی راہ پر ڈال چکے تو اب ہمارے دل کو بھٹکنے نہ دیجیے(3.8)۔

اسی لیے علامہ اقبال دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ دل مسلم کو وہ زندہ تمنا ملے جو روح کو تڑپانے کے ساتھ قلب کو گرما بھی دے اور ظلمت کے اس دور میں ہر قلب پریشاں کو محبت کا ایسا داغ عطا ہو جو چاند کو بھی شرما دے۔ جو لوگ دل کی اس اہمیت کی پاسداری نہیں کرتے ہیں، ان کے لیے اقبال کہتے ہیں کہ کیونکہ ان کے قلب میں سوز نہیں ہے تو یہ مانا جائے گا کہ ان کے لیے روح قرآن پاک کی اہمیت ناکافی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے دل میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پا جائے، وہ اگر اپنے خالق کو نہیں بھی پہچان پا رہا ہے تو اس طرح کم از کم کائنات میں اپنے خود کے مقام اور اپنی استطاعت کو تو جان لے گا۔ ان کے بقول ہمیں اللہ سے ایسا دل مانگنا چاہیے جو دیکھتا بھی ہو، کیونکہ دل کا نور آنکھ کے نور سے کہیں زیادہ معتبر ہوتا ہے۔ دل کی دیکھنے کی طاقت کو علامہ نے نگاہ شوق کا نام دیا ہے یعنی قیامت کے دن اللہ سے ملاقات کا شوق، یہ شوق رکھنے والا تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گا خدا کو خوش کرنے کے لیے۔ علامہ کہتے ہیں کہ جس انسان کی آنکھوں کی بینائی میں نگاہ شوق شامل ہو جائے، پھر اسے اس جہان کا کاروبار کچھ اور ہی نظر آنے لگتا ہے، اس کے لیے زمان ومکان کی حدود معنی نہیں رکھتی ہیں اور وہ زندگی میں بڑے سے بڑا چیلنج قبول کرنے کے لیے پوری طرح تیار رہتا ہے۔

اس مضمون میں اب تک ہم سمجھ چکے ہیں کہ دل کا تعلق عشق خدا سے ہے، جبکہ انسان کا دماغ مصلحت کے مطابق چلتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ عقل اگر مصلحت اندیش ہو تو اسے پختہ مانا جاتا ہے، لیکن اگر عشق خدا مصلحت پر منحصر ہو تو ایسے عشق کو خام سمجھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب نمرود نے اپنی جلائی ہوئی آگ میں ڈالے جانے کا حکم دیا تو انھیں ذرا بھی تامل نہیں ہوا، بلکہ اس پر وہ لبیک کہہ کر آگ میں کود پڑے جبکہ عشق خدا سے ماورا عقل انسانی اس پر ہی غور کرتی رہی کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا، حالاں کہ جب حکم خدا سے وہ آگ بجھ گئی اور اس کی جگہ ہرا بھرا باغ نظر آنے لگا تب ان لوگوں کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ عشق خدا کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں عقل انسانی کتنی محدود ہے۔ عقل کا واسطہ مظاہر سے ہے جبکہ عشق حقیقی سے لبریز دل باطن سے آشنا ہوتا ہے۔ عقل محفل صداقت کی شمع ضرور ہے لیکن حسن کی بزم کا دیا تو دل ہی ہوتا ہے۔ ایک کا رشتہ تو زمان و مکان سے ہوتا ہے لیکن دوسرا سدرۃ المنتہیٰ کو پہچانتا ہے، جس کے راستہ میں شورش طوفان حلال ہے اور عشرت منزل حرام۔ امریکہ کے ہارٹ میتھ انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق کے بعد معلوم ہوا ہے کہ دل کے اندر اپنا ایک الگ اعصابی حصہ ہوتا ہے، جسے کہتے ہیں ذہانتِ قلب (Heart Brain)، اس میں 40,000 سے زائد نیوران (Neurons) ہوتے ہیں جس کے ذریعہ آئی ہوئی اطلاع کو دل محسوس کرتا ہے، اس پر غور کرکے وہ فیصلہ وضروری کارروائی کرتا ہے، اس کے بعد وہ دماغ کو سگنل بھیجتا ہے، تاکہ وہ بھی اس سمت کارروائی کرے۔ دل کے اندر جو ہارمون پیدا ہوتے ہیں، اس میں سے آکسی ٹوسن نام کا ہارمون جذبہ محبت و عشق کا حامل ہوتا ہے، دل اپنی خود الیکٹرو میگنٹک فیلڈ پیدا کرتا ہے، جس کا خاطر خواہ اثر دماغ اور دیگر جسمانی اعضا پر ہم آہنگی کی شکل میں پڑتا ہے۔ ☐❖☐

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 02 Nov-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”وادیٔ کشمیر کو پوری دنیا کے لیے بہترین خوشنما خطہ بنایا جا سکتا ہے۔ ڈل جھیل کو دنیا کی سب سے خوبصورت جھیل بنایا جا سکتا ہے۔ ٹورزم کو بڑھاوا دینے کے لیے پوری دنیا میں ٹی وی و انٹرنیٹ پر اشتہار دیے جا سکتے ہیں۔ اس سے پورے ملک اور صوبہ کی اقتصادی حالت سدھرے گی۔“

کشمیر کے حالات کو سدھارنے کے لیے مرکزی حکومت نے پہلے کی طرح پھر ایک دفعہ گفتگو کرنے والے ایک شخص (Interlocutor) کو تعینات کیا ہے، جبکہ یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس سے قبل اس کام کے لیے کتنی مرتبہ کتنے لوگ متعین کیے گئے، انھوں نے اپنی رپورٹ میں کیا لکھا تھا اور ان کی سفارشوں پر کوئی عمل کیوں نہیں ہوا۔ کئی ماہ قبل بھی موجودہ وزیر داخلہ نے ہی ایک وفد کشمیر بھیجا تھا، وہ بھی نشستاً گفتاً برخاستاً تک محدود رہا۔ اس کے بجائے اگر حکومت یہ طے کرے کہ اپنے قلیل مدتی سیاسی نقطۂ نظر کے بجائے وہ ہندوستان اور کشمیر کے طویل مدتی مفاد کو ترجیح دے گی تو آسانی سے اور جلد یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ اُس وقت بھی میں نے وزیر داخلہ سے عرض کیا تھا کہ اگر مندرجہ ذیل 7 نکات پر مرکزی و صوبائی حکومتیں کام کرنا شروع کردیں تو جلد حالات میں بہتری آنا شروع ہو جائے گی۔ (a) کشمیر کے عوام پر مشتمل شہریوں کی 9 رکنی مانٹرنگ کمیٹی (Citizens Monitoring Committee-CMC) تشکیل دی جائے، جس میں وادیٔ کشمیر کی سول سوسائٹی کے 5 افراد ہوں، وادی کے باہر سے ملک بھر سے 2 افراد ہوں اور اور مرکزی و صوبائی حکومتوں کا ایک ایک نمائندہ ہو۔ وادیٔ کشمیر اور بیرون وادی ان پرائیویٹ اراکین میں سے ایک ایک کو-کنوینر (Co-Convener) بنایا جائے۔ ہر ہفتہ میں کم از کم دو مرتبہ اس کمیٹی اور مرکزی و صوبائی حکومتوں کے درمیان ای-میل پر خطوط کا تبادلہ ہونا چاہیے۔ (b) وادیٔ کشمیر کے عوام کے ذریعہ ان کی شکایات کو رجسٹر کرنے کی غرض سے انٹرنیٹ کے ذریعہ آن لائن پورٹل قائم کیا جائے جس کا نام رکھا جائے کشمیر ویلی سٹزنس گریوانسز پورٹل (Kashmir Valley Citizens Grievances Portal)۔ (c) کشمیری عوام کے خلاف حفاظتی فورسز کے ذریعہ مبینہ زیادتیوں سے متعلق شکایتوں کی سنوائی کے لیے 2 رکنی انکوائری کمیشن قائم کیا جائے، جس میں سے ایک رکن وادیٔ کشمیر میں سے ضرور ہو، ہر شکایت سے متعلق دریافت شدہ نتائج تین ماہ کے اندر منظر عام پر آجائیں۔

(d) کسی بھی حالات میں زخمی ہوئے کشمیری عوام کو فوراً ہوائی جہاز کے ذریعہ دہلی یا دیگر جگہ پہنچا کر ان کا مکمل علاج محبت وشفقت کے ساتھ کروایا جائے۔ (e) وادی میں ہر 10,000 کی آبادی پر ایک انفارمیشن سینٹر، ریڈنگ روم و لائبریری قائم کی جائے، جس میں سرکاری مالی امداد دی جائے اور مقامی لوگ اس کا انتظام کریں اور وہی لوگ طے کریں کہ وہاں کون سے اخبارات، کتابیں و رسالے مہیا کیے جائیں گے۔ (f) مرکزی حکومت ملک کے 500 اعلیٰ ترین انڈسٹریل ہاؤسز سے اپیل کرے کہ ان میں سے ہر ایک کمپنی وادیٔ کشمیر کے کم از کم 10 نوجوانوں کو اپنے یہاں اچھا روزگار مہیا کرے اور جو کمپنیاں ایسا کریں ان کی قومی عوامی جلسہ میں تکریم کی جائے۔ (g) دس مرکزی وزارتیں اپنے یہاں کا ہر اشتہار اردو زبان میں وادیٔ کشمیر میں پڑھے جانے والے اخبارات میں شائع کروایا کریں۔ یہ وزارتیں ہیں: اسکل ڈیولپمنٹ و آنٹرپرینیورشپ (Skill Development & Entrepreneurship)، یوتھ افئیرس (Youth Affairs)، ویمین و چائلڈ ڈیولپمنٹ (Women & Child Development)، مائیکرو اسمال و میڈیم انٹرپرائزز (Micro, Small and Medium Enterprises)، ہیوی انڈسٹری و پبلک انٹرپرائزز (Heavy Industry & Public Enterprises)، سائنس و ٹیکنالوجی (Science & Technology)، ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ (Human Resource Development)، کامرس و انڈسٹری (Commerce & Industry)، کلچر (Culture) اور مائنارٹی افیئرس (Minority Affairs)۔ وادی سے آئی ہوئی درخواستوں پر نرمی کے ساتھ خاص توجہ دی جائے۔

علاوہ ازیں سردیوں کا موسم شروع ہو چکا ہے، وادیٔ کشمیر میں بے گھر لوگوں کے لیے شب گزاری کے بسیرے بنائے جائیں۔ عدالت عالیہ نے کہہ رکھا ہے کہ پناہ گاہ حاصل کرنا انسان کا بنیادی حق ہے، شدید سردی میں جان کا خطرہ سب سے زیادہ اہم معاملہ ہے۔ ہم سب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا سب سے زیادہ سرد علاقہ کشمیر کی وادی ہے۔ جس وقت میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو سری نگر میں معمول کا درجہ حرارت 15 ڈگری سیلیسیس ہے، جو کہ شمالی ہند کی کسی بھی ریاست کے دارلحکومت سے کافی کم ہے۔ جب کہ دسمبر جنوری میں، دنیا بھر کے موسمیات کی تفصیلات دینے والے عالمی پورٹل AccuWeather.Com کے مطابق ، وادیٔ کشمیر کا درجہ حرارت 8 سے 3 ڈگری کے درمیان رہتا ہے۔ یہاں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ شمالی ہند کے دیگر سرد علاقوں اترا کھنڈ اور ہماچل پردیش کی فی کس مجموعی گھریلو پیداوار (Per Capita GDP) جموں و کشمیر سے تقریباً دوگنی ہے۔ لہٰذا شدید سردی شروع ہونے میں بہت کم مدت رہ جانے کے مدنظر حکومت بسیرے فراہم کرنے کو یقینی بنائے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ گرم بستر، گرم کپڑے (فرن وغیرہ) اور دوسری بنیادی ضرورت کی چیزیں کشمیر کے ضرورت مند لوگوں کو فراہم کی جائیں۔ صوبائی حکومت کو یہ ہدایت جاری کی جائے کہ سری نگر و دیگر اضلاع میں مقیم وہ سیکڑوں سرکاری رہائشی عمارتیں جو سردیوں کے موسم میں دربارِ حکومت جموں منتقل ہوجانے کی وجہ سے خالی پڑی رہتی ہیں، انہیں وادی کے ان لوگوں کو سر چھپانے کے لیے فراہم کیا جائے، جنھیں دیگر ذرائع سے گرم رہائش و دیگر اشیا میسر نہ کرائی جاسکیں۔

1947 میں بٹوارے کے بعد وادی ہنزہ پاکستان میں چلی گئی، جس کی وجہ سے ہمارے ملک ہندوستان کو شمالی سرحد پر نظر رکھنے کے لیے ایک مضبوط ستون کھونا پڑا۔ آزادی کے بعد سے 1950 تک ہم نے سنکیانگ کے متوازی اپنے بارڈر پوسٹ نہیں بنائے اور 1954 تک ہم نے شمالی سرحد کی نقشہ نویسی کا کام بھی مکمل نہیں کیا۔ شاید ہم کشمیر سے متعلق پاکستان سے اپنی لڑائی میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ اس بڑی عملداری سے غافل ہوگئے۔ اس وقت ہم یہی دعویٰ کر دیتے کہ برصغیر کی شمالی سرحد کے دفاع کی ذمہ داری برطانوی حکومت کے دو جانشین ممالک میں سے بڑے اور زیادہ مضبوط کو دی جانی چاہیے۔ کشمیر کے تاریخی پس منظر سے یہ بھی روشنی پڑتی ہے کہ مرکزی حکومت کے ساتھ وادی کے رشتہ کی استواری میں کمی کی بڑی وجہ ہے اس وقت کے مہاراجہ کے ہندوستان کی برطانوی حکومت کے ساتھ رشتوں کا ناہموار تاریخی سلسلہ۔ بہرحال وادیٔ کشمیر کی موجودہ بدحالی کو مرکزی و صوبائی حکومتوں کے ذریعہ بہت آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے۔ میں نے یوروپ، امریکہ، آسٹریلیا و دیگر ممالک کے متعدد علاقوں کا سفر اور وہاں قیام کیا ہے۔ ان کے تجربات سے استفادہ کر کے وادیٔ کشمیر کو پوری دنیا کے لیے بہترین خوشنما خطہ بنایا جاسکتا ہے۔ ڈل جھیل کو دنیا کی سب سے خوبصورت جھیل بنایا جا سکتا ہے۔ ٹورزم کو بڑھاوا دینے کے لیے پوری دنیا میں ٹی وی و انٹرنیٹ پر اشتہار دیے جاسکتے ہیں۔ اس سے پورے ملک اور صوبہ کی اقتصادی حالت سدھرے گی۔ کشمیر کے نوجوانوں کی اقتصادی بازیابی اور ان کے خوبصورت مستقبل کی گارنٹی کے طور پر مخصوص پلان بنایا جاسکتا ہے۔ پھر عالمی سطح پر کشمیر سے متعلق ہمارے موقف کی بہتر پذیرائی بھی ہوسکے گی۔ □❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 09 Nov-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

علامہ

اقبالیات سے نئی نسلوں کے استفادہ کا نصاب

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”اقبال اور ٹیگور کے تقابلی مطالعہ پر خاطرخواہ توجہ دی جائے۔ اقبال کے کلام اور پیغام کی اشاعت پر رسائل وجر ائد سے مددلی جائے۔تعلیمی اداروں میں دیواروں پر اقبال کے اشعار مع مختصرتشریح لکھے جائیں۔اس طور پر ہمیں اقبالیات کے قیمتی ذخیرہ کو نئی نسلوں کے دلوں پر آویزاں کرتے ہوئے ملی فلاح و بہبود کو فروغ دیناچاہیے۔“

اقبال نے خیر بخشی (یعنی زکوٰۃ، صدقہ اور قل العفو) کی معاشیات (Economics of charity) کا دل کو چھو جانے والا تجزیہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زیادہ تخیر انسان وہ اصل احتیاج کے علاوہ غیر تخیر یا کم تخیر انسان کی بھی مدد کرتا ہے۔ خیر بخشی میں جنت لے جانے والے لوگ غریبوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی مدد بھی کرتے ہیں جو حاجت مند ہونے کے باوجود تنگ دستوں کو ان کا حق نہیں دیتے ہیں۔ غیر تخیر انسان حالت قلق میں پڑا رہتا ہے جبکہ تخی انسان اس کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ قرآن کریم (59.7) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، مفہوم: انسان اپنی محنت سے جو مال حاصل کرتا ہے، اس میں ان لوگوں کا فطری حصہ ہے جو نادار ہیں یا یتیم ہیں، یا زندگی کا سفر گزارنے کے لیے بنیادی ضروریات حاصل کرنے کی استطاعت نہیں جٹا پائے۔ اللہ نے یہ بھی صاف کر دیا کہ معاشرہ کے اس مالی نظام کی اہم کڑی ہے دولت کا معاشرے میں گردش کرتے رہنا، نہ کہ اس کا چند لوگوں کے ہاتھوں میں محدود رہنا۔ اقبال نے اس حکم الٰہی کی تفسیر بیان کرنے کے لیے اس کو علم معاشیات کا اسلامی غلاف پہنا دیا ہے۔ اللہ نے انسان کے معاش میں ضرورت مندوں کے حصہ کے تعین کی بنیاد ایک متحرک میکانزم کو بنایا ہے۔ ہر صاحب نصاب کے لیے سال میں ایک دفعہ تمام دولت اور سالانہ بچت کی ڈھائی فیصد رقم زکوٰۃ کی شکل میں سورۃ توبہ کی آیت 60 میں درج آٹھ مدوں میں سے ایک یا زیادہ پر خرچ کرنا فرض ہے۔ اس کے علاوہ جو رقم انسان کے پاس بچتی ہے اس میں سے اس کو خود طے کرنا ہے کہ وہ کتنا صدقہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس فیصلے کی بنیاد ہے انسان کا ظرف جو وہ اللہ کے تئیں رکھتا ہے۔ اسی ظرف کو اللہ نے قل العفو کی اصطلاح سے قرآن پاک میں بیان کیا ہے (2.239)۔ مفہوم: وہ سب جو انسان کے پاس اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات پوری کرنے کے بعد بچے۔ اقبال نے تشویش ظاہر کی ہے کہ اس خدائی تعین مقدار سے انسان نے اپنے کو غافل کر رکھا ہے جبکہ یہی محور ہے سماجی معاشیات کی آسودگی کا۔ وہ کہتے ہیں:

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

تدریس معاشیات کے اپنے اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ سماجی معیشت میں زندہ دلی جوڑنے کے لیے انفرادی تسکین قلب اپنی اہمیت رکھتی ہے جو غیر مالی شکل میں سماج کی معاشیات کو توانائی بخشتی ہے۔ وہ مثال دیتے ہیں کہ کسی تنظیم میں کسی کارندے کو کیا لقب دیا جاتا ہے، اس پر بھی کافی حد تک منحصر ہے کہ اس کو دل لگا کر اپنا کام کرنے کی کتنی رغبت ہے۔ مثلاً اسپتال میں کام کرنے والے سرجری کے جونیئر ڈاکٹر کو ہاؤس اسسٹنٹ بھی کہا جاسکتا ہے اور اسسٹنٹ سرجن بھی، لیکن دوسری حالت میں وہ اندرونی طور پر زیادہ مطمئن رہے گا چاہے اس کی تنخواہ نہ بھی بڑھائی جائے۔ اقبال لکھتے ہیں کہ فرد کا ضبط نفس خاندانوں کی تشکیل کرتا ہے اور قوموں کا ضبط نفس ملکوں کی۔ یہاں بھی اقبال نے سماجیات، اخلاقیات اور معاشیات کے خوبصورت سنگم کی افادیت کا ذکر کیا ہے۔ ضبط نفس کی نوعیت بظاہر صرف اخلاقی ہوتی ہے لیکن اس کے انجام میں معاشی پہلو بھی ہے جس کا مجموعی دیرپا اثر سماج پر پڑتا ہے۔ رات کو جلدی سونا، صبح جلدی اٹھنا، غصہ پر کنٹرول رکھنا، معاف کرنے کی عادت ڈالنا، فضول خرچی سے بچنا، غیبت نہ کرنا، کم بولنا اور اچھا بولنا، علم حاصل کرنے کی جستجو میں رہنا، غرور نہ کرنا، دوسروں میں خوبیاں تلاش کرنا وغیرہ ضبط نفس کے اجزا ہیں۔ غور کریں کہ اگر یہ سب عادتیں کسی معاشرے کی فطرت میں شامل ہو جائیں تو وہ معاشرہ یقیناً ایک صحت مند قوم کی تشکیل کرے گا۔ اسی لیے علامہ نے کہا ہے کہ قوم کی تقدیر افراد کے ہاتھوں میں ہے۔ اقبال کو یقین ہے کہ احساس تکلیف کے باوجود صبر و تحمل ایک خدائی عطیہ ہے جس کا التفات انسانوں کو اپنی پوری زندگی پر کرنا چاہیے۔ کمزور انسان تقدیر کو تسلیم کر لیتا ہے، طاقتور اپنی روحانیت میں اضافہ کے ذریعہ تلخ واقعات حیات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور جو شخص ثابت قدم رہتا ہے اقبال پر امید ہیں کہ اس کو غم آلود اور پریشان حال دنیا کو کرب اور مشقت سے نجات دے کر حقیقی جنت کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ اس طرح کی سبق آموز تعلیمات اقبال نے اپنی شاعری میں درج کی ہیں۔ ان کے ایسے خیالات میں سے زیادہ تر ایسے ہیں کہ ان پر الگ مضمون لکھے جانے چاہئیں اور وہ غور و خوض اور مباحثے کے موضوع بنائے جائیں۔

اقبال کو صحیح خراج عقیدت یہ ہے کہ ہم پورے سال وقتاً فوقتاً ان سے موسوم محفلیں منعقد کریں جو اپنی افادیت اور نوعیت کے اعتبار سے مختلف اور متنوع ہوں۔ ان محفلوں میں نوجوان طلبا و طالبات کے ساتھ اساتذہ اور اہل ذوق کی شرکت ضروری ہے۔ یہ اسکولوں، مدرسوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، جامعات اور دیگر دانش گاہوں کے علاوہ جہاں کے خوش آہنگ و ادبی اعتبار سے منفرد علمی اجتماعات ہونے چاہئیں۔ اقبال کی نظمیں و غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھے جانے کے علاوہ بچوں کے ذریعہ اقبال کی ڈرامائی نظموں کو مکالماتی انداز میں پیش کیا جائے۔ تعلیمی اداروں کی ٹیموں پر مشتمل صرف اقبال کے اشعار پڑھتے ہوئے بیت بازی کے بین الادارتی مقابلے منعقد کیے جائیں۔ مقررین کے ذریعہ علامہ اقبال کے فلسفے و فکر کے حیات کے متعدد پہلوؤں پر خیال افروز اور فکر انگیز مقالے آسان زبان میں پیش کیے جائیں۔ ان میں علامہ کی فکر کے بے کراں زاویوں کا تذکرہ کیا جائے اور عہد حاضر میں اقبال پر کس قدر توجہ دینے کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے۔ پاور پوائنٹ پریزنٹیشن کے ذریعہ ملک و دنیا کے موجودہ منظرنامے میں پیغام اقبال کی معنویت اور اس پر عمل پیرا ہونے کی افادیت پر زور دیا جائے۔ بتایا جائے کہ ہمیں انفرادی نہیں اجتماعی سوچ رکھنی ہوگی اور علامہ سے سبق لیتے ہوئے دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کرنا ہوگا۔ اپنے کو بدل کر ہم اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں، پروردگار کے علاوہ کسی سے خوف کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ہی سے متحرک وہ کرتا ہے آنے والی نسلوں کی زندگی آسان بنانے کا انتظام کرتا ہے۔ ملت کے ساتھ قربت و ربط رکھنے سے ہی انفرادی وجود کو فروغ ملتا ہے۔ خصوصاً نوجوانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں مقابلہ میں سرفرازی حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔ اب صحرا نوردوں کا زمانہ نہیں ہے، اب تو شمع سوزاں کی طرح میان محفل گداز ہو کر رہنا ہوگا۔ ہم زبان اقبال میں دعا کریں کہ خدا ضمیر لالہ میں چراغ آرزو روشن کر دے اور چمن کی ہر پتی کو شہادت کی جستجو میں لگے رہنے کی توفیق عطا کرے۔ ان تمام پروگراموں کو آکاش وانی، دوردرشن و دیگر چینلوں سے نشر کروایا جائے۔

علاوہ ازیں ہائی اسکول اور سینئر سیکنڈری اسکول کے امتحانوں میں سب سے زیادہ نمبر لانے والے طلبا کو ہر سال اقبال ایوارڈ دیے جائیں۔ اقبال کے اشعار اور اس کی تشریح کے اسٹیکرز (Stickers) اہتمام سے شائع کر کے تقسیم کیے جائیں، جو گھروں میں فریج اور دفتر میں میز پر شیشے کے نیچے چسپاں کیے جائیں۔ اقبال کوئز کا اہتمام کیا جائے۔ اقبال کے مطالعہ کو نصاب کا حصہ بنایا جائے اور ان کی تشریح بھی شائع کی جائے۔ کلام اقبال کو موجودہ ذرائع ابلاغ کے تعاون سے مختلف صورتوں میں پیش کیا جائے۔ اقبال پر پسندیدہ ڈرامے تیار کیے جائیں جنہیں جگہ جگہ پیش کیا جائے۔ اقبال کی مختلف نظموں کے سلائڈ تیار کیے جائیں جو طلبا اور چھوٹے بچوں کے لیے مفید اور دلچسپ ہوں۔ اقبال کے اشعار کو بچوں کے لیے پینٹنگ کے مقابلہ کا عنوان بنایا جائے۔ اقبال کے کلام کے چیدہ انتخابی مجموعے تیار کیے جائیں اور اس کے لیے ورک شاپ کا اہتمام کیا جائے۔ اقبال اور ٹیگور کے تقابلی مطالعہ پر خاطر خواہ توجہ دی جائے۔ اقبال کے کلام اور پیغام کی اشاعت پر رسائل و جرائد سے مدد لی جائے۔ تعلیمی اداروں میں دیواروں پر اقبال کے اشعار مع مختصر تشریح لکھے جائیں۔ اس طور پر ہمیں اقبالیات کے قیمتی ذخیرہ کو نئی نسلوں کے دلوں پر آویزاں کرتے ہوئے ملی فلاح و بہبود کو فروغ دینا چاہیے۔

□◇□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 23 Nov-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

سول سروسز اور ینٹیشن پروگرام کا بھوپال ماڈل

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

خاندان کی ایک شادی کے سلسلہ میں گزشتہ 12 نومبر کو میں ذاتی دورہ پر بھوپال میں تھا، پھر بھی میں نے وہاں ملت سے محبت کرنے والے چند اصحاب خیر کو اپنے پروگرام کی اطلاع کر دی تھی، صبح ساڑھے نو بجے 21 لوگ مجھ سے ملنے ہوٹل تشریف لائے، دو گھنٹے کی گفتگو کے اختتام پر طے ہوا کہ میں 3 دسمبر کو پورے صوبہ مدھیہ پردیش سے بھوپال میں آئے ہوئے 500 سے زائد قابل ترین گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبا و طالبات سے سول سروسز اور ینٹیشن پروگرام میں خطاب کروں گا۔ اسی روز بعد میں صوبہ مدھیہ پردیش کے مسلم این جی اوز سے بھی خطاب کا مجھے موقع ملا، اس کی صدارت کر رہے تھے مدھیہ پردیش وقف بورڈ کے چیئرمین شوکت محمد خاں، جنھوں نے بعد میں اپنے دفتر کے احاطہ میں دو منزلہ عمارت معین کردی تا کہ اس میں صوبہ کے طلبا و طالبات زیڈ آئی ایف کے زیر نگرانی سول سروسز کے امتحان کی تیاری کریں۔ ان لوگوں نے ایک وہاٹس ایپ گروپ بنا لیا جس میں اب صوبہ بھر کے 156 ممبر ہیں، ساتھ ہی انہی میں سے 6 اشخاص پر مشتمل ایک عملی دستہ (Action Group) بھی تشکیل ہوگیا ہے۔ یہ دونوں گروپ بے لوث ہیں، ان میں صرف کام کی باتیں ہوتی ہیں اور فضول کی کاپی وہاٹس ایپ پر پیسٹ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ سب لوگ صبح و شام لگے ہوئے ہیں قابل نوجوانوں کی شناخت اور ان تک رسائی کے لیے اور ان کو مائل کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ایک ہفتہ میں ہی 326 رجسٹریشن ہو چکے ہیں اور ابھی دس روز باقی ہیں۔ بھوپال سے میری واپسی کے بعد ان خواتین و حضرات نے پھر ایک میٹنگ کر لی اور پروگرام سے متعلق کام بھی آپس میں تقسیم کر لیے ہیں۔ گروپ کے ممبر اپنے ذاتی گروپوں میں پیغام پہنچا رہے ہیں۔

مدھیہ پردیش وقف بورڈ کے سی ای او ڈاکٹر یونس خاں نے پورے صوبہ میں سرکلر بھیج دیا ہے جس کی وجہ سے اوقاف سے جڑے متولی صاحبان و دیگر لوگ بھی اس کام میں مدد کر رہے ہیں۔ مقامی اردو اخبارات میں خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ دریں اثنا بھوپال میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طلبا و طالبات کی جانب سے سرسید پر ایک سمینار منعقد ہوا اور وہاں بھی تنظیم کے سکریٹری محمد آفاق کے ذریعہ 3 دسمبر کے سول سروسز اور ینٹیشن پروگرام سے متعلق اعلان کیا گیا۔ میں سلام کرتا ہوں مدھیہ پردیش کے مسلمانوں کے جذبہ ملی کو اور امید ہے کہ دیگر صوبہ کے لوگ بھی اس ماڈل سے استفادہ کریں گے۔ مدھیہ پردیش وقف بورڈ کے چیئرمین و سی ای او قابل تحسین ہیں اس کار خیر میں آگے بڑھ کر حصہ لینے کے لیے۔ اس پوری ورزش سے یہ بھی فائدہ ہو رہا ہے کہ یہ سب لوگ اب یو پی ایس سی کے سول سروسز امتحان میں شمولیت کے لیے امیدوار کی عمر سے متعلق و دیگر ضابطے سمجھنے میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ایک خاص ایشو سامنے نکل کے یہ آیا ہے کہ رجسٹر کروانے والے نوجوانوں میں سے آدھے سے زائد او بی سی (Other Backward Classes-OBC) سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے لیے عمر کی اوپری حد میں یو پی ایس سی کے ذریعہ تین برس کی چھوٹ دی گئی ہے۔ ہاں انھیں یہ ضرور یاد رکھنا ہے کہ ان کے خاندان کی سالانہ آمدنی اگر 8 لاکھ روپے سے زیادہ ہے تو وہ او بی سی کی کریمی لیئر (Creamy Layer) میں شامل مانے جائیں گے، اس وجہ سے انھیں سول سروسز میں او بی سی والا ریزرویشن نہیں ملے گا، لہٰذا یو پی ایس سی کا فارم بھرتے وقت اس معاملہ میں خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس بھوپال ماڈل کی اطلاع میں نے لکھنؤ میں چند احباب کو دی اور ان سے گزارش کی کہ اگلے روز 4 دسمبر کو دوپہر میں وہاں بھی یو پی کے طلبا و طالبات کے لیے اسی طرح کا پروگرام منعقد کرلیں، سابق آئی اے ایس افسر انیس انصاری نے الحمدللہ اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے، میں یو پی کے اہل خیر سے درخواست کرتا ہوں کہ اس نیک کام میں ان کی مدد کریں۔

”چند برس قبل بہار کے عامر سبحانی نے سول سروسز میں ملک میں پہلا مقام حاصل کیا تھا، جبکہ ان کی شرعی داڑھی تب بھی تھی اور الحمدللہ آج تک برقرار ہے۔ میرے بیچ کے جنت حسین کا چہرہ بھی داڑھی سے منور ہے، وہ وزیراعلیٰ کے پرنسپل سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور بعد میں صوبائی چیف الیکشن کمشنر رہے۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ ہم تو سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتے ہیں کیونکہ ہم تو تعصب کا شکار ہو جائیں گے، دراصل ذاتی محنت نہ کرنے کا بہانہ اور خود شکستگی کی نشانی ہے۔“

اس ضمن میں یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ ملک کی حکمرانی میں وزیراعظم، وزرائے اعلیٰ اور دیگر وزیروں کا حصہ 5% سے زیادہ نہیں ہوتا ہے، 95% حکومت افسر شاہی (Bureaucracy or Civil Service) چلاتی ہے۔ ملک میں 654 اضلاع ہیں، جن میں ہر دن کل ملا کر 10,000 سے زیادہ سرکاری فیصلے ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک میں بھی فائل پر کسی وزیر یا سیاستداں کے دستخط نہیں ہوتے ہیں ہر فیصلہ افسر شاہی کرتی ہے، ہاں کبھی سیاستداں زبانی سفارش کر دیتے ہیں، پھر بھی ضروری نہیں کہ وزیر کی ہر بات مان ہی لی جائے، ملک کو سول سروس کے افسر ہی چلاتے ہیں، وہی قانون سازی کرتے ہیں گو کہ بل پارلیمنٹ یا اسمبلی سے پاس ہوتا ہے لیکن وزیروں کے پاس نہ وقت ہوتا ہے نہ زیادہ استطاعت کہ بل کا مسودہ تیار کریں، وہ بل پیش کر دیتے ہیں اور اس سے متعلق ایوان میں اپنی تقریر میں وہی نکتے پیش کرتے ہیں جو افسر شاہی انھیں لکھ کے دیتی ہے۔ ملک میں سرکاری کام کاج کی تمام پالیسیوں کو بھی افسر شاہ ہی تیار کرتے ہیں اور ان کا نفاذ تو وہ کرتے ہی ہیں، سرکاری فنڈ کا استعمال بھی افسر شاہوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس کا آڈٹ بھی وہی کرتے ہیں، ملک میں امن و امان قائم رکھنا بھی انہی کا کام ہے۔ اس ضخیم حکمرانی میں مسلمان صرف 2.5-3% ہی ہیں۔ لہٰذا روز مرہ کے فیصلے کرنے والے سلسلوں میں مسلمان دال میں نمک سے بھی کم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ تر فیصلے مسلمانوں کی غیر موجودگی میں ہوتے ہیں اور گاہے بہ گاہے فیصلے ان کے مفاد کے خلاف ہوتے ہیں۔ اب موجودہ مسلم طلبا کو طے کرنا ہے کہ وہ اس صورت حال کو بدلنا چاہتے ہیں کہ نہیں اور وہ سو برس بعد 2117 میں ملک کے اس وقت کے مسلمانوں کو سماج کے کس پائیدان پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ طلبا کی ہستی بینا ہے' دانا ہے اور توانا ہے وہ چاہیں تو بدل ڈالیں ہیئت چمنستاں کی۔ انھیں ساحل پر آرام کرنا چھوڑ دینا ہوگا کیونکہ وہاں تو زندگی کے نغمے مدھم ہیں، اس کے بجائے انھیں غفلت سے نکل کے سمندر کی موجوں سے لپٹ جانا ہوگا کیونکہ تگ و دو ہی حیات جاودانی ہے۔

اس کے علاوہ پورے ملک میں جتنے مسلمان انفرادی یا تنظیمی سطح پر مسلمانوں کی طرح طرح سے دیکھ بھال کرنے میں لگے ہیں، ان سب کے ذریعہ جو بھی مثبت کارروائی ہوتی ہے ان سب پر جو کل رقم وہ خرچ کرتے ہیں، اسے 'X' مان لیجیے۔ تو مرکزی و تمام صوبائی حکومتوں کے تحت جو بھی سرکاری فنڈ ہیں، اس میں سے وہ متناسب حصہ جو جائز طور پر مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونا چاہیے، صرف شرط یہ ہے کہ ملت کے خلاف تعصب نہ کیا جائے، وہ رقم کم از کم 'X' کی 10,000 گنا ہوتی ہے۔ اب غور کیجیے کہ حکمراں کرسیوں پر فائز ہونا ملت کے نوجوانوں کے لیے کتنا ضروری ہے۔ سول سروسز میں چند برس قبل کامیاب ہونے والی زینب سعید باحجاب لڑکی ہے اور اس کے باوجود انھیں یو پی ایس سی کے انٹرویو میں ملک میں سب سے زیادہ نمبر (220/275 - 80%) ملے۔ اس طرح ملت کا بھی ذہن اب صاف ہو جانا چاہیے کہ کم از کم یو پی ایس سی کا سسٹم ایسا ہے، جہاں بھید بھاؤ کے لیے جگہ نہیں ہے، بلکہ صرف قابلیت کا بول بالا ہے۔ چند برس قبل بہار کے عامر سبحانی نے سول سروسز میں ملک میں پہلا مقام حاصل کیا تھا، جبکہ ان کی شرعی داڑھی تب بھی تھی اور الحمدللہ آج تک برقرار ہے۔ میرے بیچ کے جنت حسین کا چہرہ بھی داڑھی سے منور ہے، وہ وزیراعلیٰ کے پرنسپل سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور بعد میں صوبائی چیف الیکشن کمشنر رہے۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ ہم تو سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتے ہیں کیونکہ ہم تو تعصب کا شکار ہو جائیں گے، دراصل ذاتی محنت نہ کرنے کا بہانہ اور خود شکستگی کی نشانی ہے، جس کے لیے ہمارے دین میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 30 Nov-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

حالیہ لوکل باڈیز الیکشن کا سبق اور آگے کی حکمت عملی

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

اتر پردیش میں شہری لوکل باڈیز، جنھیں ہندی میں نکائے کہا جاتا ہے، کے انتخابات گزشتہ ایک ہفتہ میں منعقد ہوئے ہیں۔ 2012 کے انتخابات میں صوبہ میں کل 632 شہری نکائے تھے۔ جس میں سے نگر پالکا پریشدوں کی تعداد 195 تھی، نگر پنچایتیں 423 تھیں اور نگر نگم 14 تھے۔ ان میں سے 59 (30 فیصد) نگر پالکا پریشدوں اور 108 (25.5 فیصد) نگر پنچایتوں میں مسلمان چیرمین تھے لیکن 14 نگر نگموں میں سے ایک میں بھی مسلم چیرمین نہیں تھا۔ یوپی حکومت کے شعبہ نگر وکاس کے خط بتاریخ 19 دسمبر 2016 کے ذریعہ زیڈ ایف آئی کو اطلاع دی گئی تھی کہ 16 اضافی نگر پنچایتیں تشکیل دی جا رہی ہیں اور اس کے علاوہ فیض آباد اور متھرا کی نگر پنچایتوں کی توسیع کر کے انھیں نگر نگم میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس طور پر 2017 کے انتخابات سے قبل یوپی میں 654 نگر نکائے ہوگئے، جن میں سے نگر نگموں کی تعداد 16 ہوگئی۔ یوپی حکومت نے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ سہارنپور کی نگر پالکا کو یکم اکتوبر سے تبدیل کر کے نگر نگم بنا دیا گیا ہے اور حد بندی و ریزرویشن کی کاروائی پوری ہونے کے بعد انتخاب کروایا جائے گا لیکن اس کام میں اتنا طویل عرصہ کیوں لگ گیا، اس کا جواب حکومت نہیں دے سکی۔ مردم شماری 2011 کے مطابق شہر سہارنپور کی آبادی 7 لاکھ سے کچھ زیادہ ہے، جس میں 46 فیصد مسلمان ہیں، شہر مرادآباد کی آبادی 8.8 لاکھ ہے، جس میں سے 47 فیصد مسلمان ہیں اور شہر بریلی کی آبادی 9 لاکھ سے زیادہ ہے، جس میں سے مسلمان 39 فیصد ہیں۔ اب تو انتخابات ہو چکے صرف یہ دیکھنا ہی رہ گیا ہے کہ یوپی میں مسلمانوں نے کتنے فیصد ووٹ دیا اور متحد ہوکر ووٹ دیا کہ نہیں۔

بلند شہر اور سکندر آباد کی نگر پریشدوں کی مجوزہ حد بندی کے خلاف ضلع مجسٹریٹ کے پاس تحریری احتجاجات داخل کیے گئے تھے، اس پر ان کے دفتر میں یکم مئی 2017 کو سنوائی ہوئی۔ دستاویزوں کی بنیاد پر ضلع مجسٹریٹ کو بتایا گیا کہ ان کے ذریعہ مجوزہ حد بندی میں ضابطوں کی خلاف ورزی ہو رہی ہے (صاف طور پر بغیر یہ کہتے ہوئے کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے)۔ لیکن انھوں نے بغیر کوئی تحریری وضاحت کرتے ہوئے اس احتجاج کو مسترد کرتے ہوئے اپنی تخلیقی تجویز کی بنیاد پر ہی صوبائی حکومت کے ذریعہ فائنل حد بندی آرڈر نکلوا دیا۔ قانون یہ ہے کہ جب انتخابی کاروائی شروع ہوجائے تو عدالت کا حق مداخلت معزول ہوجاتا ہے، اب انتخابی کاروائی ختم ہوجانے کے بعد صوبائی حکومت کے آرڈر کے خلاف عدالت میں کاروائی کی جائے گی تا کہ یہ مدعا زندہ رہے اور کم از کم اگلے الیکشن سے قبل عدالتی کاروائی مکمل ہو جائے۔ یہاں اس بڑی تصویر پر غور کرنے کی اہم ضرورت ہے کہ پورے ملک میں ہر دس برس کی مردم شماری کی روشنی میں انتخابی حلقوں اور وارڈوں کی حد بندی میں ترمیم کرنا حکومت کے قانونی فرائض میں شامل ہے۔ پارلیمنٹ نے لوک سبھا اور اسمبلیوں کے انتخابی حلقوں میں اس ترمیم پر طویل مدتی (2026 تک) روک لگا رکھی ہے لیکن لوکل باڈیز کے لیے ایسی کوئی روک نہیں ہے۔ لہٰذا پورے ملک میں ہر مردم شماری کے اعداد کی روشنی میں لوکل باڈیز کی حد بندی میں ترمیم کا سلسلہ مستقل کہیں نہ کہیں چلتا رہتا ہے اور اس میں حد بندی کے قانون وضابطوں کی خوب خوب خلاف ورزی کر کے مسلم آبادیوں کو بیجا طور پر تقسیم کر کے اور تقسیم شدہ حصوں کو بڑی متصل غیر مسلم آبادیوں میں ضم کر کے مسلمانوں کی انتخابی اہمیت کم یا ختم کرنے کی مہم لگاتار چل رہی ہے۔ یاد رہے کہ یہ سارا کام بھی افسر شاہی ہی کرتی ہے۔

اسی لیے میں نے گزشتہ 13 اپریل اور 22 جون کے اپنے مضامین کے ذریعہ یوپی میں ہونے والے شہری نکایوں کے الیکشن سے قبل وارڈوں کی حد بندی درست کروانے کے لیے طریقہ کار تفصیل سے بیان کر دیا تھا اور صوبہ کے افراد ملت سے اپیل کی تھی کہ اپنے اپنے ضلع میں وقت سے ضروری کاروائی کر لیں تا کہ ملت کی حق تلفی کے سلسلہ پر کچھ لگام لگے۔ میرے ایک مضمون کا عنوان ہی تھا 'حد بندی سے متعلق ہمیں اپنی غفلت سے باہر آجانا چاہیے' اور یہ تمام تفصیل تبھی سے zakatindia.org پر حد بندی کے مد میں پڑی ہوئی ہے۔ لیکن اس پر کتنا عمل ہوا یہ تو الیکشن کے نتائج ہی بتائیں گے۔ یوپی کے تمام ضلع مجسٹریٹوں سے ہم لوگوں نے حق اطلاع قانون کے تحت مجوزہ حد بندی کی تفصیل اور نقشے بھی مانگ لیے تھے، بہتوں نے یہ اطلاع مہیا کر دی تھی اور وہ مواد بھی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ وہاں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آر ٹی آئی کے تحت اطلاع حاصل کرنے کے لیے کس طرح خط لکھا جانا چاہیے۔ بہرحال حد بندی درست کروانے کے لیے تگ و دو تو ملت کی طرف سے ہمیشہ ہی چلتی رہنی چاہیے کیونکہ اس کام میں ہم نے 70 برس تک اتنی غفلت برتی ہے کہ آج ہماری آبادی والے زیادہ تر علاقوں کو انتخابی حلقوں یا وارڈوں کی شکل دینے میں ہمارے حقوق کی دھجیاں اڑا دی گئی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی چل رہا ہے اور آئندہ بھی چلتا رہے گا، اگر ہم نے اس پر گرفت لگانے کو اپنا فریضہ سمجھ کر اس کی درستگی کو ایک خاموش انقلاب کی شکل نہیں دی تو ملت کو زبردست خسارہ ہوجائے گا۔ یہاں خاموش کا لفظ میں نے دانستہ طور پر استعمال کیا ہے، اس معاملہ میں ہمیں بہت سمجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا، قارئین نے غور کیا ہوگا کہ اب تک اس سلسلہ میں ہم لوگ کتنا کام کر سکے ہیں، اس کا ذکر کہیں بھی ہندی یا انگریزی میڈیا میں نہیں آیا، صرف اردو تحریروں کے ذریعہ ملت میں بیداری پیدا کرنے کا کام کیا گیا ہے۔ اپنے کو با اختیار بنانے کے لیے ہم جو بھی طویل مدتی ادارہ ساز کاوشیں کریں ان کا اہل وطن کے درمیان شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

❞ حد بندی درست کروانے کے لیے تگ و دو تو ملت کی طرف سے ہمیشہ ہی چلتی رہنی چاہیے کیونکہ اس کام میں ہم نے 70 برس تک اتنی غفلت برتی ہے کہ آج ہماری آبادی والے زیادہ تر علاقوں کو انتخابی حلقوں یا وارڈوں کی شکل دینے میں ہمارے حقوق کی دھجیاں اڑا دی گئی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی چل رہا ہے اور آئندہ بھی چلتا رہے گا، اگر ہم نے اس پر گرفت لگانے کو اپنا فریضہ سمجھ کر اس کی درستگی کو ایک خاموش انقلاب کی شکل نہیں دی تو ملت کو زبردست خسارہ ہوجائے گا۔ ❝

حد بندی کے اس کام میں اکابرین ملت کو تو دامے درمے قدمے سخنے شامل ہونا ہی ہوگا، ساتھ ہی پورے ملک میں سالانہ پلان کے تحت بروقت اور باقاعدہ یہ کام کرتے رہنے کے لیے ادارہ سازی کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ شروعات میں ملک بھر سے 25 تعلیم یافتہ نوجوانوں کی شناخت کر کے انھیں اچھی تنخواہ پر اور رہائش مہیا کر کے باقاعدہ ملازمت میں رکھنا ہوگا، یہ کہلائیں گے حد بندی آفسر یا ڈیلمٹیشن آفسر۔ ان کے تعین میں صرف قابلیت کام کرے گی نہ سفارش چلے گی اور نہ رشتہ داری یا دوستی۔ انھیں ٹریننگ دینے کے لیے ایک ڈیلمٹیشن اکیڈمی قائم کرنی ہوگی جس میں وہ لوگ زیر ملازمت رہ کر ٹریننگ دیں گے جو مرکزی و صوبائی الیکشن کمیشنوں میں یا ضلع کے الیکشن آفس میں تعینات رہ کر یہ کام کر چکے ہوں۔ میری درخواست ہے کہ اہل ملت ایسے لوگوں کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کر دیں۔ اس اکیڈمی میں وقتاً فوقتاً قلیل مدتی کورسز ملی رضا کاروں کے لیے بھی منعقد کیے جائیں گے۔ آزادی کے وقت ہر سمت عدم استحکام اور افراتفری کا ماحول تھا لیکن ایک مرد مجاہد حکیم عبدالحمید ان حالات میں بھی دہلی کے اطراف میں زمین خرید رہا تھا، جس پر اب تناور درخت ہمدرد یونیورسٹی کی شکل میں قائم ہے، اللہ حکیم صاحب کی روح کو جنت میں اعلیٰ مقام پر فائز کرے، آمین۔ وہی روحانی حوصلہ اور جسمانی توانائی فی الوقت ہم سب میں ہونی چاہیے 'ہمیں دوراندیشی اور حکمت عملی سے آگے بڑھنا ہوگا۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 07 Dec-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

سول سروسز کے ذریعہ ملت بااختیار بن سکتی ہے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”ہفتہ وار یا پندرہ روزہ مانٹرنگ سیشن کے دوران ان بچوں کا آپس میں پہلے سے دیے گئے عنوان پر گروپ ڈسکشن ہوگا، جو بچے زیادہ زیادہ بہتر کارکردگی پیش کریں گے انھیں انعام ملے گا۔اس طرز پر برسوں تیاری کرنے کے بعد جب یہ بچے گریجویشن کرلیں گے تو پہلی کوشش میں ہی سول سروسز امتحان میں کامیاب ہوسکیں گے، ان شاء اللہ۔ دیگر صوبوں میں بھی اس ماڈل پر مثبت کام شروع ہوجائے تو ملت کو بااختیار بننے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

مدھیہ پردیش اور اتر پردیش کے قابل ملی نوجوانوں میں بیداری پیدا کرنے اور انھیں آمادہ کرنے کے لیے کہ وہ اپنے من میں ڈوب کر اپنی اہلیت کو پہچان کے اسے بروئے کار لائیں اور اس طرح اپنی زندگی کا سراغ پا کر ملت کو با اختیار بنائیں اور ملت کے کھوئے ہوئے حقوق کو اسے واپس لوٹانے کی تگ و دو کر سکیں، رواں ہفتہ کے دوران بھوپال اور لکھنؤ میں سول سروسز اورینٹیشن پروگرام منعقد کیے گئے۔ دونوں صوبوں میں وہاں کے این جی اوز، اسکالرس اور دیگر ذی فکر خواتین و حضرات نے خوب بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ لکھنؤ میں تو عیدگاہ عیش باغ کے امام مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے پورے پروگرام کی ذمہ داری ہی قبول کرلی اور اسے بہترین طور پر پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ وہاں پروگرام کے اگلے روز مولانا کلب صادق نے اپنی طبیعت ناساز ہونے کے باوجود اپنے یونیٹی کالج میں اس کام کے لیے میٹنگ رکھی تا کہ اس اورینٹیشن پروگرام کی روشنی میں ملت کے ذریعہ آگے کی کارروائی کے لیے ایکشن پلان تیار کیا جاسکے۔ بھوپال میں مدھیہ پردیش وقف بورڈ کے چیئرمین شوکت محمد خاں کی قیادت میں بورڈ نے اپنے کو آگے کی کارروائی سے بھی جوڑ لیا ہے۔ وہاں ندیم انور اور پرویز باری اور لکھنؤ میں محمد خالد اور محسن صدیقی و دیگر افراد زمینی سطح پر اس ملی مشن کو کامیاب بنانے میں لگ گئے ہیں۔ خصوصاً دو سطحوں پر زیادہ کام ہونا ہے۔ جو قابل طلبا حال میں ٹیکنیکل گریجویشن یا نان ٹیکنیکل پوسٹ گریجویشن کر چکے ہیں، انھیں فوراً جولائی 2018 میں ہونے والے سول سروسز پریلم امتحان (Prelims Exam) کی تیاری میں لگ جانا چاہیے اور اس کے لیے اگر دیگر گائڈنس یا مدد درکار ہو تو وہ اپنے صوبہ میں مندرجہ بالا اشخاص سے رابطہ قائم کریں۔

اس سے قبل سبھی امیدوار یہ یقینی بنائیں کہ ان کے گھر میں پڑھائی کرنے کے لیے علیحدہ ان کی میز اور کرسی ہو، وہ ہر روز موبائل فون کو 14-12 گھنٹے بند رکھیں اور ٹی وی دیکھنا مکمل طور پر بند کردیں۔ ٹی وی سے جو سنجیدہ خبریں معلوم ہوتی ہیں، وہ زیادہ تفصیل سے انگریزی کے اخبار ’ہندو‘ میں روز دو گھنٹے تک پڑھیں اور ایک الگ رجسٹر میں اس کے نوٹس (Notes) تیار کریں۔ ان کے والدین سے گزارش ہے کہ وہ اس امیدوار کو گھر کے کاموں سے بری الذمہ رکھیں۔ این سی ای آر ٹی (NCERT) کی 12-6 درجوں کی سائنس، حساب، سماجیات (Social Studies) اور انگریزی کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کریں اور اس کے بھی نوٹس بنائیں، کچھ یاد رکھنا مشکل ہو تو اسے حفظ کرلیں۔ سول سروسز کے جنرل اسٹڈیز کے پرچوں کی تیاری کے لیے مخصوص کتابیں بازار میں موجود ہیں، ان میں سے یا تو ٹی ایم ایچ (TMH-Tata McGraw Hill) یا پیئرسن (Pearson) کی کتاب خرید کے اپنے پاس رکھیں اور روزانہ اس میں سے زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ ظاہر ہے کہ امیدوار کی مادری زبان انگریزی نہیں ہوتی ہے، لیکن ہر امیدوار کو کامیاب ہونے کے لیے 999 دیگر امیدواروں پر سبقت لے جانی ہوتی ہے، جس کے لیے طرح طرح کے طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا فوری طور پر ہمارے امیدوار کوشش کر کے انگریزی میں ہی گفت و شنید کرنا شروع کر دیں، اس سے ان کو آگے تمام مقامات پر فائدہ ہی ہونا ہے۔ پریلمز امتحان میں دو پرچے ہوتے ہیں، ایک جنرل اسٹڈیز کا 200 نمبر کا، جس میں 100 سوال ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے چار جواب دیے ہوتے ہیں، امیدوار کو کسی ایک پر نشان لگانا ہوتا ہے، اگر غلط جواب پر نشان لگا دیا تو دیگر ایک صحیح جواب کے نمبر میں سے ایک تہائی کاٹ دیا جائے گا، اسے کہتے ہیں منفی مارکنگ (Negative Marking)۔ اس پرچہ میں ہندوستانی سیاسی سسٹم، جغرافیہ، تاریخ، ہندوستانی اقتصادیات، سائنس و ٹیکنالوجی، آب و ہوا و ماحولیات، بین الاقوامی تعلقات اور ان سب سے متعلق تازہ ترین پیش رفت پر سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

پریلمز امتحان کے دوسرے پرچہ میں امیدوار کی ذہنی قابلیت پرکھی جاتی ہے ، اس کا نام ہے سول سروسز اپٹیٹیوڈ ٹسٹ (CSAT-Civil Services Aptitude Test)۔ اس کے بھی 200 نمبر ہوتے ہیں اور اس میں 80 سوال پوچھے جاتے ہیں، اس میں بھی غلط جواب دینے پر منفی مارکنگ ہوتی ہے۔ اس میں دماغی ورزش ، ذہنی تجزیہ ، کچھ سمجھ کے پڑھنے کے بعد سوالات اور فیصلہ لینے کی اہلیت کا ٹسٹ ہوتا ہے۔ یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ امیدوار اپنی بات کو دوسرے کو کس قدر بخوبی سمجھا سکتا ہے، اور اعداد و شمار کو پرکھنے کی اس میں کتنی سمجھ ہے۔ پریلمز امتحان میں لاکھوں امیدوار شامل ہوتے ہیں اور اس کے نتیجہ کی بنیاد پر 30.000 امیدواروں کا تعین کیا جاتا ہے، جنھیں مینز امتحان (Mains Exam) میں شمولیت کی اجازت ہوتی ہے۔ پریلمز میں حاصل کیے گئے نمبر آگے کہیں بھی نہیں جوڑے جاتے ہیں۔ مینز امتحان میں زیادہ پرچے ہوتے ہیں جن میں سے اب تک ایک مضمون امیدوار اپنی مرضی کا بھی لے سکتا تھا، لیکن اب خبر آئی ہے کہ وہ حق انتخاب اب ختم کردیا گیا ہے۔ میڈیا کے مطابق یو پی ایس سی سول سروسز امتحان میں مجوزہ تبدیلیوں کو وزیر اعظم نے حال میں منظوری دے دی ہے۔ اس کے مطابق پریلمز امتحان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہاں اس کے بعد کی اگلی سیڑھی یعنی مینز امتحان میں سے امیدوار کی مرضی کا پرچہ (Optional Paper) ختم کردیا گیا ہے۔ اس کے بجائے جنرل اسٹڈیز کے ہی دو اضافی پرچے جوڑ دیے گئے ہیں، ایک آرگینائیزیشنل مینجمنٹ (Organizational Management) کا اور دوسرا اسٹیٹسٹکس اینڈ ڈیٹا انالسس (Statistics & Data Analysis) کا۔ ان دو اضافی پرچوں کی تیاری کے لیے ملت کے پڑھے لکھے سمجھدار لوگ اگر مختلف مقامات پر تھوڑی مخصوص کوچنگ کا انتظام کر دیں گے تو امیدواروں کو کافی مدد مل سکتی ہے۔ ایک دیگر معمولی سی تبدیلی یہ ہے کہ جو لوگ مینز امتحان میں بھی کامیاب ہوجاتے ہیں، ان کے انٹرویو کے لیے اب تک 275 نمبر متعین تھے، جسے کم کر کے اب 250 نمبر کردیے گئے ہیں۔ سارے امیدوار یو پی ایس سی کی ویب سائٹ پر نظر رکھیں کہ ان تبدیلیوں کے اعلان کے لیے کب نوٹیفکیشن جاری ہوتا ہے۔ مینز امتحان کے جو پرچے اب بھی موجود ہیں، وہ سب بھی جنرل اسٹڈیز کے ہیں جبکہ ان میں سے ہر ایک کی وسعت و دسترس جداگانہ ہے، جس کی تفصیل امیدواروں کو یو پی ایس سی اور دیگر متعلقہ ویب سائٹوں پر دیکھنی چاہیے۔

مدھیہ پردیش اور اتر پردیش کے اصحاب ذی فکر نے ایک اور سطح پر بھی مستقبل کے امیدواروں کی ابھی سے نشاندہی کر کے انھیں سول سروس کی طویل مدتی تیاری پر لگانے کے لیے پلان تیار کیا ہے۔ اس کے لیے یہ لوگ مسلم اسکولوں سے رابطہ کر کے نویں کلاس (9th Class) کے ہر سیکشن کے 5-3 قابل ترین طلبا کی فہرست تیار کر کے ان سب کا ایک ساتھ ضلع میں ایک جگہ اتوار 14 جنوری کو ٹسٹ لیں گے، جس کا نام ہوگا ZFI Jr Fellowship Test۔ اس میں سے چنندہ قابل ترین بچوں کو ہر دن اپنی اسکولی پڑھائی کے علاوہ مندرجہ بالا طرز پر اضافی پڑھائی کرنی ہوگی، ہر دس بچوں پر ایک رضا کارانہ مرشد (Mentor) ہوں گے جو خود بھی وہی سب پڑھائی کریں گے اور اس طرح شروع میں ہر ہفتہ اور بعد میں مہینہ میں دو دفعہ ان بچوں کی اس اضافی پڑھائی کی مانٹرنگ کریں گے۔ اس ہفتہ وار یا پندرہ روزہ مانٹرنگ سیشن کے دوران ان بچوں کا آپس میں پہلے سے دیے گئے عنوان پر گروپ ڈسکشن ہوگا، جو بچے زیادہ زیادہ بہتر کارکردگی پیش کریں گے انھیں انعام ملے گا۔ اس طرز پر برسوں تیاری کرنے کے بعد جب یہ بچے گریجویشن کرلیں گے تو پہلی کوشش میں ہی سول سروسز امتحان میں کامیاب ہوسکیں گے، ان شاء اللہ۔ دیگر صوبوں میں بھی اس ماڈل پر مثبت کام شروع ہوجائے تو ملت کو بااختیار بننے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 14 Dec-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

بی جے پی اقتدار والی ریاستوں کا منظر نامہ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”اُدھر حکومت راجستھان نے محکمہ صحت کو احکامات جاری کیے ہیں کہ پورے صوبہ میں اس محکمہ میں کتنے مسلمان کام کررہے ہیں، ان کی گنتی کی جائے۔ میڈیا کے ذریعہ پوچھے جانے پر محکمہ کے افسر نے بتایا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ کا نفاذ کیا جانا ہے، اس لیے یہ اعداد جمع کیے جارہے ہیں۔ عقل میں نہیں آرہا ہے کہ اچانک اپنی سیاسی پارٹی کے قومی ایجنڈے سے ہٹ کر بلکہ اس کے برخلاف اس صوبائی حکومت کو سچر رپورٹ کیوں یاد آ گئی۔“

آسام میں مسلمانوں کی شہریت کے مسئلہ کے لیے سپریم کورٹ میں چل رہے مقدمات میں گزشتہ ہفتہ بظاہر کچھ راحت ملی ہوئی دکھائی پڑتی ہے لیکن یہ مسئلہ بہت زیادہ پیچیدہ ہے اور اس صوبہ کے سیاسی حالات اس وقت اچھے نہیں ہیں، لہٰذا ملت کو بہت زیادہ متحرک رہنے کی ضرورت ہے۔ ملک کے شہریوں کے قومی رجسٹر (NRC: National Register of Citizens) میں اندراج کے ذریعہ صوبہ کے تمام جائز شہریوں کو انصاف دلوانا بہت ضخیم کام ہے اور اس کام کے لیے ملک کے وکیل، ایڈووکیٹ و دیگر ذی فکر اصحاب خیر کو آگے بڑھ کے آسام کے مسلمانوں کی منظم امداد کرنی چاہیے۔ آزادی کے بعد سے اب تک چار مرتبہ ووٹروں کی فہرست یا الیکٹورل رول پر نظر ثانی (Electoral Roll Revision) ہو چکی ہے، آخری مرتبہ 1997 میں یہ کام ہوا، اس وقت 2,31,000 افراد ضروری دستاویز وقت سے داخل نہیں کر پائے، انھیں ڈی ووٹر (D Voter: Disputed/Doubtful Voter) قرار دیا گیا۔ 2007 میں تشکیل شدہ کیبنٹ سب کمیٹی نے لائحہ عمل طے کیا تھا جس کے تحت کارروائی کے خلاف 2010 میں کل آسام مائنارٹی یونین نے احتجاج کیا، پولیس فائرنگ میں چار لوگ جاں بحق ہوئے، 2011 میں ایک اور سب کمیٹی بنی، جسے نومبر 2014 میں مرکزی حکومت نے منظوری دے دی، اس دوران 2013 میں سپریم کورٹ نے NRC کے کام کی مانٹرنگ شروع کر دی۔ 68 لاکھ خاندانوں نے رجسٹر میں اندراج کے لیے درخواست دی جس کی تصدیق چل رہی ہے۔ آن لائن اور موقع پر جا کر چھان بین سے معلوم ہوا کہ 95 فیصد سے زیادہ درخواستیں صحیح ہیں۔ دریں اثنا گزشتہ برس 2016 میں منعقد صوبائی اسمبلی الیکشن کے بعد نئی سرکار کے آنے کے بعد سے نئی دقتیں پیدا ہونے لگیں۔ ہر تھانہ میں بارڈر پولیس کا ایک اے ایس آئی تعینات ہے، یہ لوگ من مانے طور پر شہریت کی درخواستوں کو ایس پی کو بھیج دیتے ہیں یہ لکھ کر کہ یہ بھی ڈی ووٹر ہیں۔ حال میں NRC نے فیلڈ افسروں سے کہا کہ ڈی ووٹروں کی تازہ ترین فہرست بھیجی جائے۔ شہریت کی درخواست پر گرام پنچایت میرج سرٹیفکیٹ سے لنک کر کے تصدیق کرتی ہے، جس کی ریونیو سرکل افسر توثیق کرتا ہے، ہائی کورٹ نے کہہ دیا کہ اس تصدیق و توثیق کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ اس آرڈر کے خلاف گزشتہ نومبر کے دوران سپریم کورٹ میں سات عدد اسپیشل لیو پٹیشن (SLP: Special Leave Petition) داخل ہوئیں۔ الحمدللہ سپریم کورٹ نے گوہاٹی ہائی کورٹ کے آرڈر کو رد کر کے حق بجانب فیصلہ دیا ہے کہ گرام پنچایت کے سرٹیفکیٹ کو شہریت کی بنیاد مانا جائے۔ اب پھر صوبہ میں زمینی سطح پر ضرورت مندوں کی قانونی اور دستاویزی امداد کیے جانے کی اشد ضرورت ہے جس کے لیے ملت کو آگے بڑھ کے معاون ہونا چاہیے۔

کیرالہ کے امیر احمد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم اور ہندوستان، خلیجی ممالک اور برطانیہ کے ممتاز سرمایہ کار ہیں، اللہ نے ان کے دل میں یوپی کے مسلمانوں کے لیے محبت ڈال دی۔ انھوں نے فکر کی کہ یوپی کے مسلمان بھی کیرالہ کی طرح تعلیمی، اقتصادی اور سماجی میدانوں میں آگے بڑھیں۔ یوپی کے ایک مسلمان کے ذریعہ قائم شدہ تعلیمی ادارہ سے انھوں نے ذاتی استفادہ کیا تو خود اہل استطاعت ہونے پر یوپی کے مسلمانوں کی فلاح میں لگ گئے دامے، درمے، قدمے، سخنے۔ مشہور عالم دین مولانا کلیم صدیقی کو ان کا پلان پسند آ گیا، انھوں نے پھلت میں زمین دی، جس پر وِژن انٹرنیشنل اکیڈمی قائم ہو گئی جہاں حافظہ مکمل کرنے کے بعد بچے انگریزی، حساب، سائنس اور سماجیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کرنے کے ساتھ کوئی ہنر بھی سیکھیں گے اور اپنا کاروبار کریں گے یا سول سروسز وغیرہ مقابلہ کے امتحان میں بیٹھیں گے۔ طویل تحقیق کرنے کے بعد امیر احمد نے ایک اہم نکتہ یہ بتایا کہ حافظہ کیے ہوئے بچوں کی ذہانت کی سطح اوسط سے بہت اونچی ہوتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان طلبا کی اس غیر معمولی ذہانت کا بھرپور استعمال ملت کرے۔ یوپی کے کئی دیگر اضلاع میں بھی متعدد فلاحی کام شروع ہو گئے ہیں، لکھنؤ میں صوبائی دفتر بھی قائم ہو گیا ہے۔ 1993 میں انھوں نے اپنی کمپنیوں کی کارپوریٹ سماجی ذمہ داری (Corporate Social Responsibility-CSR) نبھانے کے لیے ایک سماجی فلاحی تنظیم منٹ فاؤنڈیشن قائم کر دی تھی، جس کے تحت 2015 میں متعدد اصحاب فکر سے گفت و شنید کی روشنی میں انھوں نے وژن 2040 کی اسکیم بنائی ہے، یعنی ملت کی رویئت 2040 میں کیسی ہونی چاہیے، وہ اس وقت ملک میں کیسی دکھائی پڑنی چاہیے۔ خصوصی طور پر یوپی کو اس لیے چنا گیا ہے کیونکہ یہاں کی آبادی میں سے تقریباً ایک تہائی غریبی کی لائن سے نیچے (BPL: Below Poverty Line) ہے اور اس میں بھی مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ خراب ہے۔ اس اسکیم کے تحت اب تک 'ہمارا اسکول' کے نام سے ضلع علی گڑھ میں چار مقامات پر ایسے ادارے قائم کیے گئے ہیں، ان میں اُن بچوں کو تیار کیا جاتا ہے جو کبھی اسکول نہیں گئے، اس کے بعد انھیں کسی باقاعدہ اسکول میں داخل کروا دیا جاتا ہے۔ علی گڑھ، ہاتھرس اور بجنور میں ضرورت مندوں کے لیے سردی کے کپڑے و بستر مہیا کیے گئے، رمضان میں سامان تقسیم کیا گیا، میانمار کے پناہ گزینوں کو عید کا تحفہ دیا گیا، ملک کے مالیاتی نظام کے تعارف کے لیے ورک شاپ منعقد کی گئیں۔ علی گڑھ، ہاتھرس، نجیب آباد و لکھنؤ کی کئی تنظیمیں ان کے ساتھ شانہ بہ شانہ شامل ہیں۔ یوپی کی ملت کو اس کام میں تعاون کرنا چاہیے۔

اُدھر حکومت راجستھان نے محکمہ صحت کو احکامات جاری کیے ہیں کہ پورے صوبہ میں اس محکمہ میں کتنے مسلمان کام کررہے ہیں، ان کی گنتی کی جائے۔ میڈیا کے ذریعہ پوچھے جانے پر محکمہ کے افسر نے بتایا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ کا نفاذ کیا جانا ہے، اس لیے یہ اعداد جمع کیے جارہے ہیں۔ عقل میں نہیں آرہا ہے کہ اچانک اپنی سیاسی پارٹی کے قومی ایجنڈے سے ہٹ کر بلکہ اس کے برخلاف اس صوبائی حکومت کو سچر رپورٹ کیوں یاد آ گئی اور اگر نیک نیتی ہے بھی تو اس کے لیے مسلمانوں کی گنتی کروانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی اور کیا اسکیم تیار کی گئی ہے۔ راجستھان کے مسلمانوں کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ میکس اسپتال کی طرف سے قانون کی خلاف ورزی ہوئی تو اسپتال کا لائسنس رد کر دیا گیا، یہ ایسا ہے کہ نوزائیدہ بچے کو نہلانے کے بعد ٹب کے پانی کے ساتھ خدانخواستہ بچے کو بھی بہا دیا جائے۔ جو سیکڑوں مریض فی الوقت وہاں زیر علاج ہیں، ان کا کیا ہوگا۔ یہ تو پھر بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اسپتال کے انتظام کے لیے کوئی معروف این جی او یا سرکاری افسر متعین کر دیا جائے، لیکن سرے سے اسپتال ہی بند ہو جائے کیونکہ اس کا لائسنس رد ہو گیا، چھوٹا مسئلہ حل کرنے کے لیے بڑا مسئلہ پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ راجستھان کے راج سمند میں شمبھو لال ریگر نے محمد افرازالاسلام کو اس وجہ سے کلہاڑی سے زخمی کر کے آگ لگا کے مار دیا کیونکہ اسے اور مبینہ طور پر غیر مذہب کی کسی لڑکی میں آپس میں محبت ہو گئی تھی۔ اول تو دستور ہند میں اس طرح کی محبت منع نہیں ہے، دوسرے یہ کہ اس طرح کی وحشیانہ حرکت پر سخت ترین سزا دی جانی چاہیے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 28 Dec-2017 | Print Edition of Roznama Sahara

آذر بائیجان: عالمی اسلامی یکجہتی کا علمبردار

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

> ”آذر بائیجان کے روحانی پیشوا شیخ الاسلام اللہ شکر پاشازادہ نے فرحت کا اظہار کیا کہ کانفرنس میں مندوبین جغرافیائی طور پر پوری دنیا کی نمائندگی کرر ہے ہیں۔انھوں نے انتباہ کیا کہ سیاسی غرض کے لیے مذہب کا استعمال ہرگز نہیں کیا جانا چاہیے۔عوام میں ایک طبقہ ایسا ضرور ہو جو اچھائی کی طرف لوگوں کو بلائے اور خرابیوں سے دور رہنے کی تلقین کرے۔“

آذر بائیجان کی دار السلطنت باکو میں گزشتہ ہفتہ بین الاقوانی کانفرنس کا عنوان تھا '2017 : اسلامی یکجہتی کا سال: بین المذ اہب و بین الثقافت ڈائیلاگ'۔ حالانکہ آذر بائیجان 26 برس قبل ہی آزاد ہوا ہے پھر بھی اس نے اپنے کو متحرک رکھ کر عالم اسلام کے کئی میدانوں میں اپنے ذمہ قاعدانہ رول لے لیا ہے۔الہام علی یو 2003 سے وہاں کی کرسی صدارت پر فائز ہیں، انھوں نے اب سے ایک برس قبل ہی 2017 کو اسلامی یکجہتی سال کے طور پر منائے جانے کا اعلان کر دیا تھا جس کی اختتامی تقریب کے لیے اب اس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تلاوت کلام پاک سے آغاز کے بعد الہام علی یو نے بتایا کہ باکو کا شمار عالم اسلام کی ثقافتی راجدھانیوں میں کر لیا گیا ہے۔ یہ کام دراصل بین الاقوامی اسلامی تعلیمی، ثقافتی و سائنسی تنظیم (ISESCO:International Islamic Educational Cultural and Scientific Organization) کرتی ہے، اس کا مرکزی دفتر اردن کے شہر رباط میں ہے۔ اب تک عرب ، ایشیائی اور افریقی علاقوں میں سے ہر ایک میں نو شہر اس فہرست میں شامل کیے جا چکے ہیں۔ مکہ مکرمہ سرفہرست ہے، باقی شہروں میں مدینہ منورہ کے علاوہ نجف، شارجہ، تریپولی، غزنی، اسکندریا، اسفہان، تاشقند، کوالا لمپور، کویت، جکارتا، ڈھاکہ، لاہور وغیرہ شامل ہیں۔ ہندوستان کا کوئی بھی شہر اس میں شامل نہیں ہے جبکہ حیدرآباد، بھوپال، لکھنؤ، سری نگر، کولکاتا، ملاپورم، اورنگ آباد، پرانی دہلی، رامپور، علی گڑھ، آگرہ، مرشدآباد، بیجاپور، جوناگڑھ، کرنول، سورت، مالدہ، ڈھبری، کشن گنج، کریم گنج، ہیلا کنڈی، بارپیٹا، راجوری کو اس فہرست میں شامل کروانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ آئی سیسکو کی افتتاحی کانفرنس 1982 میں مراقش کے شہر فاس میں ہوئی تھی۔ 54 مسلم ممالک کی مکمل رکنیت کے علاوہ روس ، تھائی لینڈ اور سائی پرس کی اس میں آبزرور کی حیثیت ہے۔ 2025 تک ہر سال جن نئے شہروں کو آبزرور کا درجہ دیا جائے گا اس فہرست کا اعلان بھی ہو چکا ہے، ہندوستان کو بھی یہ درجہ ملنا چاہیے۔ مرکزی وزارت اقلیتی امور اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کو وزارت خارجہ کے توسط سے اس معاملے میں جدوجہد کرنی چاہیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ہمدرد یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی کو بھی اس تنظیم سے رابطہ کرنا چاہیے کیونکہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مخصوص تدریسی و تحقیقی معاونت کرنا بھی اس کے چارٹر میں شامل ہے۔

باکو کانفرنس میں ایران و ترکی کے صدر، پوپ فرینسس، روس اور جیارجیا کے پیٹری آرک اور آئی سیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کے مخصوص نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ جن دیگر ممالک کے اسکالرز نے تقاریر کیں ان میں ہندوستان سے شری شری روی شنکر کے سفیر اور راقم السطور کے علاوہ جاپان، امریکہ، برطانیہ، سعودی عرب، لبنان، تاجکستان، اُزبیکستان، کرگستان، الجیریا، مصر، افغانستان، فلسطین، مراقش، جرمنی، عراق، انڈونیشیا اور متعدد بین الاقوامی تنظیموں کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے نمائندے شامل تھے۔ آذر بائیجان کے صدر نے یہ بھی بتایا کہ امت مسلمہ کو اندرونی طور پر مضبوط کرنے کے لیے وہ اقوام متحدہ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، ایک دوسرے کی ثقافت کو باہمی فروغ دیتے ہیں اور کوشاں رہتے ہیں کے ہر مذہب کے ماننے والوں کو دنیا میں برابر کے حقوق ملیں۔ انھوں نے یہ بھی پروجیکٹ چلا رکھا ہے کہ اقوام متحدہ کے تحت مختلف تہذیبوں کی ایک مشترکہ عالمی اتحادی تنظیم قائم کی جائے۔ انھوں نے زور دیا کہ ثقافتوں کی کثرت میں عالمی برادری کو خوشی محسوس کرنی چاہیے۔ اس پیش رفت کے تحت سعودی عرب کی دارالسلطنت ریاض میں عالمی اسلامی یکجہتی کھیل کود تنظیم قائم ہے جس کے 59 ملک ممبر ہیں۔ افتتاحی کھیل کود 1985 میں ہوئے تھے جس میں 34 ممالک کی ٹیمیں آئی تھیں۔ رواں سال میں یہ کھیل کود آذر بائیجان میں جاری ہیں جس میں 50 ممالک حصہ لے رہے ہیں۔ بہر حال عالمی امن اور بین الاقوامی مصالحت کے لیے آذر بائیجان خاص کر کوشاں ہے، وہاں لق ودق گیس پائپ لائن بچھانے کا بھی کام چل رہا ہے اور یہ ملک اپنے کو نقل و حمل کا بین الاقوامی مرکز (Transportation Hub) بنا لینے میں بھی لگا ہوا ہے اور سبھی پڑوسی ممالک سے اس کے بہترین تعلقات ہیں۔

باکو کانفرنس میں متعدد نمایاں ملکوں نے اپنے نمائندوں کے ذریعہ 2017 کو اسلامی یکجہتی سال منائے جانے پر خوشی جتائی۔ ساتھ ہی ڈونالڈ ٹرمپ کے ذریعہ یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی تسلیم کیے جانے پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کیا۔ کانفرنس میں اس فیصلہ کی اور ساتھ ہی روہنگیا مسلمانوں کے خلاف میانمار حکومت کے تشدد کی مزمت کی گئی اور عموماً دنیا کے تمام پناہ گزینوں کے لیے امداد کی وکالت کی گئی۔ صدر ایران کے نمائندے نے کہا کہ داعش فسطائی طاقتوں کی ہی پیداوار ہے اور اسے مکمل شکست دینا ہم سب کا فریضہ ہے۔ صدر ترکی کے نمائندے نے زور دار وکالت کی کہ یروشلم کے تعلق سے اپنا فیصلہ امریکہ کو فوراً واپس لے لینا چاہیے۔ عیسائی رہنماؤں نے کہا کہ اسلام کو تشدد سے جوڑنا عدل کے خلاف ہے، ہمیں ایک دوسرے کا احترام کرنا ہوگا۔ ہمیں تعلیم اور ثقافت کے میدان میں مشترکہ پروجکٹ کرنے ہوں گے۔ دیگر مسلم نمائندوں نے زور دیا کہ ہمیں مل کے اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے کوشش کرنی ہو گی۔ ہمارے تعلیمی اداروں کے نصاب میں اسلامی یکجہتی کے سبق شامل کیے جانے چاہئیں۔ عالم اسلام کی یونیورسٹیوں کی وفاقی تنظیم بنائی جائے۔ مسلمانان عالم کے واجب مسائل کے حل میں ان کی مدد کی جائے۔

آذر بائیجان کے روحانی پیشوا شیخ الاسلام اللہ شکر پاشازادہ نے فرحت کا اظہار کیا کہ کانفرنس میں مندوبین جغرافیائی طور پر پوری دنیا کی نمائندگی کرر ہے ہیں۔ انھوں نے انتباہ کیا کہ سیاسی غرض کے لیے مذہب کا استعمال ہرگز نہیں کیا جانا چاہیے۔ عوام میں ایک طبقہ ایسا ضرور ہو جو اچھائی کی طرف لوگوں کو بلائے اور خرابیوں سے دور رہنے کی تلقین کرے۔ اسکولی کتابوں کے مندرجات کی وقتاً فوقتاً جانچ ہوتی رہنی چاہیے۔ شری شری روی شنکر کے نمائندہ جیوتی رمایا نے کہا کہ ہم سب کو طرز عمل (Practices) اور رسومات (Rituals) کو بالائے طاق رکھ کر اقدار (Values) پر ہی زور دینا چاہیے۔ راقم السطور نے اپنے پاور پوائنٹ پرزنٹیشن میں عرض کیا کہ اس سے قبل کہ دنیا وجود میں آتی لوح محفوظ پر سے وہ تمام حکایات جو وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مستقبل کے پیغمبروں پر بھیجنے والے تھے وہ دنیاوی آسمان پر ایک خاص شب میں اتار دی گئی تھیں، یہی شب بعد میں رمضان المبارک کی مقدس شب قدر بنی۔ چند مفسرین کا خیال ہے کہ حضور اقدسؐ کے علاوہ جن دیگر نبیوں پر کتابیں اتریں اس تعلق سے بھی یہی رات مقدس ہے۔ آگے کی صدیوں میں لوح محفوظ میں سے وہ تمام نسخہ کیمیا نکلے جو بعد میں متعدد رسولوں کو دئے گئے، اس طرح لوح محفوظ تمام مذاہب کا قدس الاقداس (Sanctum Sanctorum) ہے۔ لہٰذا لوح محفوظ کے وجود اور اس میں مختلف وحیوں کے مشترکہ اندراج سے بہتر بین المذاہب ہم آہنگی کا اشارہ دنیا میں کہیں اور نہیں ملتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سبھی انسانوں کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تا کہ وہ دنیا میں ہمارا امتحان لے کہ ہم مختلف گروپوں سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اپنے دل میں جگہ بناتے ہیں کہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ربّ العالمین سے شروع ہوتا ہے اور ربّ الناس پر ختم ہوتا ہے، اس نے ربّ المسلمین پر اکتفا نہیں کی۔ لہٰذا اسلامی سماج کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اپنے کو یکجہت کر کے دیگر عالم کو بھی اخوت و ہم آہنگی کا سبق سکھائے خاص کر سیاستدانوں اور حکومتوں کو۔ □❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔